مرقع مشاہیر

مؤلفہ و مرتبہ

مولوی سید محفوظ علی منشی کامل



پبلشر

لالہ رام نراین لعل بک سیلر

الہ آباد

سنہ ۱۹۳۶ء

مرقعِ مشاہیر

مرتبہ

مولوی سید محفوظ علی منشی کامل



پبلشر

لالہ رام نرائن لعل بک سیلر

الہ آباد

سنہ ۱۹۳۶ء

فہرست مضامین



بقراط

اس سے پیشتر ہم نے جتنے لوگوں کے حالات لکھے ہیں وہ سب حکیم اور فلسفی تھے، مگر اب ہم ایک ایسے نامی گرامی شخص کی طرف توجہ کرتے ہیں جو نہ حکیم تھا نہ فیلسوف بلکہ صرف ایک طبیب تھا۔ اور حکیم تھا بھی تو انھیں معنوں میں جن معنوں میں کہ ہماری زبان میں بیماریوں کا علاج کرنے والے حکیم صاحب کہلاتے ہیں۔ لیکن جس طبیب کو ہم نے اُس کے حالات زندگی لکھنے کے لئے منتخب کیا ہے وہ طبیب بھی ہے تو اتنا بڑا اور اس پایہ کا کہ تمام حکیم اُس کے پیرو ہیں اور اُس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اور تسلیم کرتے ہیں کہ علم طب کا وہی موجد و بانی تھا۔

موجودہ یورپین تاریخ اہل یونان کی تحریریں اور عرب مورّخین سب کو اتفاق ہے کہ بقراط ہی دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے دوا اور علاج کے فن کو علم طب بنایا۔ اُس کو

یہ وقعت دی اور ہر جگہ اور ہر ملک میں کثرت سے طبیب پیدا کر دئے۔
بیماریوں کی دوا کرنا اور دفع مرض کے طریقے معلوم کرنا فطری
چیز ہے۔ جب سے انسان دنیا میں آیا، جب سے وہ بیمار ہوا اُسی
وقت سے اُسے علاج کی بھی فکر ہوئی۔ مگر ابتداءً درد و مرض میں
نفع بخشنے والے چٹکلے خدا کی رحمت و نعمت خیال کئے جاتے تھے۔
اور اُن کا معلوم ہو جانا خدا کی خاص مہربانی بلکہ الہام و وحی تصوّر
کیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چیزیں اب بھی حقیقت میں
خدا کی برکت و عنایت ہیں مگر اُس وقت یہ چیزیں خلافِ قیاس
معجزے اور غیر معمولی نعمتیں سمجھی جاتی تھیں اور اب کوئی خلافِ
قیاس کرامت یا معجزہ نہیں باقی رہیں۔ اسی وجہ سے ابتداءً ہر جگہ
علاج کرنا اور دفع مرض کی تدبیریں بتانا۔ مذہبی مقتداؤں کاہنوں
اور زاہدوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ وہ لوگ اُنھیں کے ذریعے
سے اپنی فضیلت جتاتے اپنے آپ کو خدا کے مقبول بندے ثابت
کرتے اور جو تدبیریں علاج کی معلوم ہو جاتیں اُنھیں کیمیا کے
نسخوں کی طرح مخفی رکھتے۔ یونان میں بھی یہ فن اسی عنوان اور
اسی صورت سے شروع ہوا۔ خصوص اسقلینوس نام کا ایک
شخص ہے جسے لوگ خدا بنانے کیا کچھ مذہبی وقعت دے رہے

تھے۔ اسقلینوس بھی اپنے معلومہ نسخوں اور اپنے طرز علاج کو کسی پر
ظاہر نہ کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ فن اسی کے خاندان میں چلا اور
نہایت ہی مخفی رموز کی طرح نسلاً بعد نسلاً سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا۔
اس خاندان کے وارث یونانیوں میں دینی اور دنیوی حیثیت
سے معظم و محترم سمجھے جاتے تھے اور امیر و غریب ہر شخص کے مرجع و
ماویٰ تھے۔ یہاں تک کہ نویں پشت پر پہنچ کے قریبا میس نام کا
اسی خاندان کا ایک شخص یونان کا بادشاہ ہوگیا۔ مگر اب بھی
فن طب ایک لعل بے بہا کی طرح انھیں لوگوں کے خزانے میں
تھا اور بند تھا۔ الغرض تین سو سال کے اندر اٹھارہ پشتیں گذریں
تھیں اور ان میں سات بڑے معزز گراں پایہ اور معجز نما طبیب
ہو چکے تھے کہ اٹھارویں پشت میں بقراط پیدا ہوا جسکا نام زیب عنوان
ہے۔ بقراط کا نام یونانی میں ایفوقراطیس تھا مگر عربوں نے تصرف
کرکے اپنی زبان میں بقراط بنایا جو ان کے ذریعے سے ساری
مشرقی دنیا میں پھیلا۔ بقراط کے باپ کا نام ایراقلیدس تھا اور
دادا کا نام بقراط۔ اس لئے کہ عربوں کی طرح یونانیوں میں بھی یہ
رواج تھا کہ اکثر دادا اور پوتے کا ایک ہی نام ہوتا۔ اسکی بیوی
فرکسیبشا نام کی ایک خوش نصیب عورت تھی جو حکیم ایرقلیس کے

گھرانے کی بیٹی تھی اور جس کے بطن سے ۴۶۰ ق۔م قبل مسیح میں یعنی ولادت حضرت سرورِ کائنات سے ایک ہزار تین سال پیشتر یونان کے شہر قو میں بقراط پیدا ہوا۔ ابھی اچھی طرح ہوش و حواس نہیں سنبھالنے پایا تھا کہ باپ نے اپنا خاندانی علم سکھانا شروع کیا۔ چونکہ دادا ہنوز زندہ تھے لہذا اُنھوں نے بھی اپنی پختہ مغزی اور اپنے تجربوں سے اُسے سبق دیا۔ اکثر قواعد علاج اور ادویہ کے خواص اوّل تو صرف باپ دادا کے لوحِ دل پر لکھے ہوئے تھے اور چند تحریروں میں تھے بھی تو اس وضع سے ایسے مجہول اشاروں اور علامتوں میں اور ایسے نامعلوم خط میں کہ جب تک بتائے نہ جائیں کوئی پڑھ نہ سکتا تھا۔ الغرض عنفوانِ شباب ہی تھا کہ خاندانی رموز و تجربات کو حاصل کرکے بقراط ایک باکمال طبیب بن گیا۔ چنانچہ اُس کے حالات لکھنے والے موّرخ کہتے ہیں کہ وہ پچانوے برس دنیا میں رہا، جن میں سے صرف سولہ برس طالب علمی اور علم طب سیکھنے میں صرف کئے اور باقی زندگی اُستادِ فن اور ایک باکمال طبیب کی حیثیت سے بسر کی۔

اُس نے غالباً باپ دادا کے مرنے کے بعد غور سے دیکھا

تو علم طب بہت ہی تنزل کی حالت میں تھا۔ جاننے والے گنتی کے لوگ تھے اور اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو ان چند لوگوں کے ساتھ یہ شریف اور ضروری فن بھی ختم ہو جائے۔ علاوہ بریں اُس نے خیال کیا کہ علم طب نوع انسانی کے لئے عام طور پر ضروری ہے لہذا اس کو بھی اُسی حد تک عام ہونا چاہیئے جس حد تک کہ انسان بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ الغرض انھیں اسباب و امور کو سوچ کے بقراط نے کوشش کی اور اس بات پر کمر باندھی کہ اس شریف فن کو عام کر دے اور جہاں تک بنے اُس کے جاننے والوں کی تعداد بڑھائے۔ ان دنوں رموز طبّی کے ماہر صرف دو شخص تھے۔ ایک تو یہی بقراط جو یونان کے شہر قوس میں تھا اور دوسرا دیمقراطیس جو شہر ابدیرا میں تھا۔ دیمقراطیس کی طبیعت پر فلسفہ اور حکمت کے الٰہیات اس قدر غالب آئے کہ زہد و تقویٰ میں منہمک ہو کے گوشہ نشین ہو گیا لہذا بقراط تن تنہا ہی اپنے اغراض کے پورے کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ توجہ کرتے ہی اُس کو ایک اور بات نظر آئی۔ وہ یہ کہ اُس کے خاندان والے اطبّا میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور اُسے خوف ہوا کہ یہ اختلاف منجر بسفاہو کے فن طب ہی کو مٹا دے۔ اُس نے پہلا یہ کام کیا کہ

مسائل طب اور رموز علاج کی کتابوں اور عام فہم تحریروں میں مدون کرنا شروع کیا۔ پہلے اپنی بیٹی مالانا ارسا دو بیٹوں ثاسلس اور دراقن کو اور ایک ذہین وطبیعت دار شاگرد قولوبس کو یہ فن سکھانا شروع کیا۔ پھر غریبوں اور فقیروں کے لڑکوں کو عام طور پر سکھانے لگا تاکہ علم طب کے فوائد اور خاندان اسقلیبنوس کی برکت گھر گھر پھیل جائے اور اس صحت بخش چشمے سے ہر شخص یکساں طور پر فیضیاب ہو سکے۔ شہر قو میں اپنے مکان کے قریب اپنے ہی ایک باغ میں سب سے علیحدہ ایک جگہ مقرر کی جہاں مریض لاکے رکھے جاتے اور اُن کے لئے تیماردار اور خدمتگار مقرر کئے جو ہر وقت مریضوں کی خبر لیتے رہتے۔ اس مقام کا نام اخسندوکین رکھا۔ جس کے معنی بیمارستان کے ہیں اور اِسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ بقراط وہ شخص ہے جس نے دنیا میں سب سے پہلا شفاخانہ قائم کیا۔ درس وتدریس کے لئے اپنی اور اپنے شاگردوں کی مدد سے اُس نے تین درسگاہیں قائم کیں۔ ایک تو خاص شہر قو میں جہاں خود رہتا تھا دوسری شہر رودس اور تیسری شہر قنیدس میں۔ مگر جب دیکھا کہ علم طب جاننے والے کثرت سے پیدا ہوتے جاتے ہیں اور فن شریف اسقلیبنوس کے خاندان

ہی سے نہیں بلکہ اُس کی گرفت سے بھی باہر ہوا جاتا ہے تو
ایک عہد نامہ اور حلف نامہ مرتّب کیا جس کے مطابق ہر طالب علم
سے قول و قسم لے لیا جاتا تھا۔ وہ عہد نامہ سچ پوچھیے تو ایک طبیب
کے لئے نہایت ہی ضروری چیز ہے اور چونکہ یونانی اطبّاء میں
سے ہر متنفس بقراط ہی کے گھرانے کا شاگرد ہے اور اُسی کے
نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ لہذا ہمیں ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ
اس عہد نامے کو تمام و کمال نقل کر دیں۔ ہمارے اطبّار کو ضرورت ہے
کہ اُسے پڑھیں اور اُس کے پابند بنیں ورنہ وہ بقراط کے سچّے پیرو
اور شاگرد رشید نہ ہوں گے۔ اُس کی عبارت حسب ذیل ہے:۔
میں قسم کھاتا ہوں اُس پروردگار عالم کی جو پیدا کرتا اور
مارتا ہے اور شفاء اور ہر دوا کا خالق ہے اور قسم کھاتا ہوں
اسقلینوس کی اور تمام اولیاء اللہ کی عام اِس سے کہ وہ عورتوں
میں ہوں یا مردوں میں اور اُن سب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ
میں اس عہد کو پورا کروں گا۔ اُس کی تمام شرطوں کو بجا لاؤں گا
اور اِس علم و فن میں اُستاد کو بجائے باپ کے سمجھوں گا اپنی آمدنی
میں سے اُس کی مدد کروں گا اور اُسے جب کبھی روپے کی ضرورت
ہوگی اپنے سرمایہ سے اُس کی خدمت کرونگا اور جو دولت اُسکے

ورثے میں مجھے ملے گی اُس میں سب بھائیوں کو شریک سمجھوں گا۔ اُنھیں اگر اس علم کے سیکھنے کی ضرورت ہوگی تو میں سکھاؤں گا اور بغیر اس کے کہ اُن سے کچھ اُجرت لوں یا کوئی نئی شرط کروں اپنی اولاد اُستاد کی اولاد اور اُن تمام شاگردوں کو جن سے حُرمت طلب کا عہد لیا گیا ہو اور جن سے یہ شرطیں لی جا چکی ہوں اُن سب کو وصیتوں علموں اور اُس علم کے تمام متعلقات میں اپنا شریک و سہیم سمجھوں گا مگر غیروں کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوگا۔ حتّی الامکان اپنے معاملات اور اپنی جملہ تدابیر میں میرا مقصود صرف یہی ہوگا کہ مریضوں اور بیماروں کو نفع پہنچاؤں اور جو چیزیں اُن کے حق میں مضر ہوں یا جن سے اُن پر جور کرنا ملحوظ ہو اپنی رائے کے مناسب اُنھیں اُن سے منع کرتا اور روکتا رہوں مجھ سے اگر کوئی سمی اور قاتل دوا مانگی جائے تو نہ دوں گا اور نہ کسی کو ایسی دوا کے استعمال کا مشورہ دوں گا اور نہ عورتوں کو کسی ایسی چیز کے قریب جانے دوں گا جس سے اسقاط حمل کا اندیشہ ہو۔ اپنی تدبیروں اور اپنے اعمال طبّی کی ضرورت سے اپنے نفس کو ہمیشہ پاک اور طاہر رکھوں گا۔ جس کے مثانہ میں پتھری پیدا ہو گئی ہو اُسے بھی اپنے ہاتھ سے چاک کرکے نہ نکالوں گا۔

بلکہ اس کام کو انھیں لوگوں کے لئے چھوڑ دوں گا جن کا یہ
کام ہے۔ میں جس گھر میں داخل ہوں گا میری نیت یہی ہو گی کہ
مریضوں کو نفع پہنچاؤں ہر جور و فساد کے ارادے سے ہمیشہ
اپنے آپ کو بچاؤں گا۔ عام اس سے کہ وہ مردوں کے متعلق ہو
یا عورتوں کے متعلق، آزادوں کے متعلق ہو یا لونڈی غلاموں کے
متعلق۔ جن امور کو میں اثنار علاج میں دیکھوں یا سنوں گا اور وہ
ایسے امور ہوں جو راز کی حیثیت رکھتے ہوں اور پوشیدہ ہوں،
اُن کو راز سمجھ کے اپنے سینے میں رکھوں گا اور کبھی کسی پر انھیں
ظاہر نہ کروں گا۔ جو اس عہد و پیمان اور قول و قسم کا پابند رہے
اپنے علاجوں میں کامیاب ہو اپنے تدابیر میں مقصد ور اور بامراد
رہے اور ہمیشہ لوگ اُس کی مدح و ثنا کریں اور جو کوئی اُس کے
خلاف کرے اُس کی حالت بھی اُس کے خلاف ہو۔

یہ ہیں شرطیں اور اقرار جن کی پابندی ہر علم طب سیکھنے
والے کو کرنی پڑتی تھی بقراط کو اِن ہدایات میں اور لوگوں کو ان
اصولی اخلاق کا پابند بنانے میں یہاں تک اہتمام تھا کہ
اس قسم کے اقرار نامے لینے پر بھی اطمینان نہ ہوا اور ایک اور
وصیت نامہ لکھ کے اپنے تمام پیرووں میں پھیلا دیا یہ اقرار نامہ

کیسا ہے اطبّاء اور معالجوں یا علم طب حاصل کرنے والوں کے لئے ایک ضروری اور واجب التعمیل دستور العمل ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

علم طب کے طالب علم کو چاہیئے کہ آزاد ہو، طبّاع ہو، نو عمر ہو، متوسط القامت ہو اور متناسب الاعضاء ہو۔ ذکی و ذہین ہو، خوش بیان ہو۔ مشورہ لینے میں اُس کی رائے صائب ہو، پاکباز و متّقی ہو۔ گناہوں و معاصی سے بچتا ہو۔ شجاع ہو۔ حریص و طامع نہ ہو۔ غصّے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور نہ ایسا ہو کہ کبھی غصّہ ہی نہ آئے۔ کُند ذہن نہ ہو۔ بیمار کے دُکھ درد کا شریک ہو۔ اُس کے حال پر شفیق ہو اور اُس کے رازوں اور رموز کا محافظ رہے۔ اس لئے کہ بہت سے مریض ہمیں اپنے وہ حالات بتا دیا کرتے ہیں جو کسی اور کو ہرگز نہ بتائیں۔ سخت و سُست سُننے پر برداشت و تحمّل سے کام لے کیونکہ بعض مجنون اور مختل الحواس ہمیں گالیاں دینے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اُس کی طبیعت کا فعل نہیں بلکہ اُس کے مرض کا فعل ہے۔ سر کے بالوں کی حالت بھی متوسط ہو یعنی نہ سر منڈوائے اور نہ بالوں کو اِتنا بڑھائے کہ جوڑے اور چوٹی کی طرح باندھے جائیں اِتنے اعتدال

کی ضرورت ناخنوں میں بھی ہے۔ اُس کے کپڑے سفید اور پاک و نرم ہوں۔ نہ تیز چلے۔ اس لئے کہ یہ طیش و برہمی کا خاصہ ہے اور نہ بہت ہی آہستہ چلے اسلئے کہ یہ نفس انسانی کا نقصان ہے۔ مریض کے دیکھنے کو جائے تو چار زانو بیٹھے اور خاموشی سے اُس کے حالات سُننے اور اُن کے سُننے میں بے لطفی اور گھبراہٹ نہ ظاہر کرے۔

جالینوس کہتا ہے بقراط طب کے علاوہ علم ہیئت و نجوم بھی ایسا اچھا جانتا تھا کہ اُس کے ہمعصروں میں سے کسی کو وہ لیاقت نہیں حاصل تھی۔ جن ارکان سے کہ جسم انسانی کی ترکیب ہے اُن کو بھی خوب سمجھا ہوا تھا۔ اس امر میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا کہ جن اجسام میں کون و فساد ہوتا ہے کیوں ہوتا ہے کیونکر ہوتا ہے اور کن اسباب سے ہوتا ہے۔ اِن امور سے واقف ہی نہ تھا بلکہ وہی پہلا شخص ہے جس نے اِن پر قوی و قابل تسلیم دلیلیں پیش کیں اور اس بات کے ثبوت پیش کیے کہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسموں میں کیونکر صحت قائم رہتی ہے اور مرض پیدا ہوتا ہے تو کیونکر اور کیوں۔ اِسی شخص نے سب سے پہلے امراض جسمانی کا استقرار و استنباط کیا اور اُن کا علاج بتایا۔

زندگی بھر اُس کا اور کوئی کام نہ تھا بجز اس کے کہ علم طب

غور کرتا اُس کے قواعد ایجاد کرتا۔ بیماروں کا علاج کرتا اور اُن کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ اپنی کتاب اپیڈیمیا میں بہت سے مریضوں کے حالات اور اُن کی سرگذشتیں بیان کی ہیں۔ سب سے بڑی یہ بات تھی کہ حرص و طمع نام کو بھی نہ تھی۔ دولت و ثروت کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ وہ صرف اِتنا ہی روپیہ چاہتا تھا جتنا اُس کے حوائج ضروری کے لئے کافی ہو سکے چنانچہ اِسی کی برکت تھی کہ بادشاہوں کی خدمت اور درباداری سے بھاگتا تھا۔ جالینوس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ ایران اردشیر نے جو دارا بن دارا کا دادا تھا اور جسے یونانی ارطخششت کہتے ہیں، سقراط کو اپنے دربار میں بلوانا چاہا اور سبب یہ ہوا کہ اُن دنوں فارس میں ایک وبا نمودار ہوئی تھی اور اُس میں مبتلا ہو ہو کے ایرانی اس کثرت سے مرنے لگے کہ اردشیر نے گھبرا کے اپنے عامل قو کو لکھا کہ بقراط کے پاس سو قنطار سونا بھجوا اُسے راضی کر کے نہایت تعظیم و تکریم اور شان و شوکت کے ساتھ ادھر روانہ کر دو۔ اُس پر یہ بھی ظاہر کر دو کہ یہ جو کچھ دیا گیا بمقابلہ اُس کے جو آیندہ ملے گا بہت کم ہے اور اُس مال و دولت کے علاوہ بہت سا علاقہ بھی دیا جائے گا۔ پھر اُس کے ساتھ اردشیر

نے فرماں روائے یونان کے نام بھی اس مضمون کا ایک خط بھیجا کہ بقراط کے ادھر روانہ کرنے میں میری مدد کرو۔ اگر تم نے اس امر میں مدد دی تو سات برس تک تم امن و امان میں رہو گے اور ادھر سے تم پر کوئی حملہ نہ کیا جائیگا۔ الغرض یہ امور بقراط کے سامنے پیش ہوئے مگر اُس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ یونان کی چونکہ خود بھی غرض تھی لہذا اُس نے اصرار کیا اور بالحاح بھیجنے کی کوشش کی جس کے جواب میں سقراط نے یہ مختصر جواب دیا کہ میں مال و دولت کے معاوضے میں فضیلت دعلم کو نہیں خرچ کر سکتا۔

پھر اس کے بعد جب یونان کا بادشاہ بروقلیس بیمار ہوا تو اُس کے پاس بھی بقراط کبھی نہیں گیا بلکہ اُسے چھوڑ کے مسکینوں اور غریبوں کے علاج میں مشغول رہا اور انھیں غربا کے علاج کے شوق میں اُس نے تمام بلاد یونان کا دورہ کیا اور اس قدر پھرتا پھراتا رہا کہ اسی سفر کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے اپنی وہ کتاب تصنیف کی جو یونان کے شہروں اور قریوں کی آب و ہوا پر ہے

بعض مورخین کا بیان ہے کہ بقراط بہمن بن اردشیر کے عہد میں بھی تھا۔ ایک مرتبہ یہ فرمانروا بیمار ہوا اور اِس نے

ں اپنے علاج کے لئے بقراط کے بلانے کی کوشش کی
اور اہل قو یعنی بقراط کے وطن والوں کو لکھا کہ جس طرح بنے اُسے
میرے دربار میں روانہ کرو مگر شہر والے اُس کے نام پر اسقدر
فدا تھے اور اُس کی خوبیوں کے ایسے عاشق تھے کہ ایسے گراں پایہ
طبیب کا جانا کسی طرح گوارا نہ کیا اور بہمن کو لکھ بھیجا کہ ہم اُسے نہیں
بھیج نسکتے۔ لیکن اگر زبردستی بلایا گیا تو قبل اس کے کہ اُس کا قدم
ہمارے شہر سے نکلے ہم سب لڑکے مر جائیں گے۔ یہ سُن کے بہمن
کو ترس آیا اور اپنے ارادے سے باز آگیا۔ اس واقعہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ اردشیر کے وقت تک بقراط کے وطن شہر قو پر
فرمانروائے یونان کا قبضہ تھا اور اب بہمن کے دور میں یہ شہر
سلطنت فارس کی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ عجیب و غریب
واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ بقراط کے زمانے میں
اقلیمون نام کا ایک حکیم قیافہ شناسی کا مدعی تھا۔ اور دعویٰ کرتا
تھا کہ جس شخص کا حلیہ دیکھے یا سُنے اُس کے اخلاق و عادات کو
بتا دے گا۔ بقراط کے شاگردوں نے ایک دن باہم بیٹھ کے
کہا اب اس وقت روئے زمین پر بقراط سے زیادہ نیک نفس
اور لایق کوئی شخص نہیں۔ آؤ اُس حکیم سے اُس کا حلیہ بیان کر کے

پوچھیں، دیکھیں کیا کہتا ہے چنانچہ اقلیمون کے پاس گئے اور بقراط کا پورا حلیہ بتا کر کہا۔ فرمائیے ایسے شخص کے اخلاق کیسے ہوں گے۔ اُس نے غور و تامّل کر کے کہا ایسا شخص تو چاہیے کہ زانی و شہوت پرست ہو۔ طلبہ نے کہا۔ آپ نے غلط بتایا۔ یہ حلیہ بقراط کا تھا جس کی نیک نفسی و پارسائی کو زمانہ جانتا ہے یہ سُن کے اقلیمون نے کہا۔ تم جو چاہے خیال کرو میں تو اب بھی وہی کہتا ہوں جو کہہ چکا۔ طلبہ وہاں سے واپس آئے اور ساری سرگزشت بقراط سے بیان کی۔ اُس نے سُن کے کہا "اقلیمون نے سچ بتایا۔ میری طبیعت زنا و شہوت پرستی کی طرف بہت زیادہ مائل ہے مگر ہاں خدا نے مجھے اپنے نفس پر قابو دیا ہے جس کی وجہ سے کبھی اُس کی خواہشوں پر عمل نہیں کرتا۔"

چونکہ بقراط کے حلیے کا ذکر آیا لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ناظرین اُس کی تصویر بھی دیکھ لیں اور خیال کریں کہ علم طب کے پہلے موجد و مدوّن کی صورت کیسی ہے۔ وہ ایک متوسط القامت گورا چٹّا اور خوش رو شخص تھا۔ آنکھیں شربتی ہڈّیاں بڑی بڑی اور چوڑی، سارے پنڈے میں اعصاب یعنی پٹھوں کی کثرت، متوسط درازی کی سفید نورانی ڈاڑھی، پیٹھ

ذرا خمیدہ اور سر بڑا آہستگی اور وقار کے ساتھ حرکت کرتا ہے، جدھر پھرتا ہے سارے جسم سے پھرتا ہے۔ اکثر سر جھکائے ہوئے نظر آتا ہے۔ جو بات کہتا ہے گفتگو میں نرمی ہے اور جس بات کو کرتا ہے سمجھانے کے لئے مکرر سہ کرر کہتا ہے۔ جب کسی صحبت میں بیٹھتا ہے تو جوتیاں آنکھوں کے سامنے رکھی رہتی ہیں۔ اُس کی نظر اکثر زمین پر رہتی ہے اور گفتگو میں کسی قدر مذاق بھی ہے اکثر روزہ رکھتا ہے اور روزہ نہ ہو تو بھی غذا میں تقلیل کرتا ہے اور آپ جب دیکھیں گے اُس کے ساتھ ہاتھ میں یا تو نشتر ہوگا یا سرمہ لگانے کی سلائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمل جراحی بھی اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ لیکن اس سے پیشتر جو عہدنامہ نقل کیا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے شاگردوں کے لئے اس کام کو ناپسند کرتا تھا جیسا کہ اطبائے یونانی میں مروّج ہے کہ صرف دوا اور تدبیر بتا دینا اطبا کا کام ہے اور چیرنا پھاڑنا یا نشتر دینا جرّاحوں کا کام۔ اس کے ساتھ انگریزی مورّخین کا بیان ہے کہ وہ طبابت اور جرّاحی دونوں کام کرتا تھا۔ ان اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک وہ جرّاحی بھی کرتا

تھا مگر ایک محدود حد تک اور عموماً اُن دنوں چیرنا پھاڑنا طبیبوں
کے علاوہ اور لوگوں کا کام تھا۔

آخر ایک طولانی عمر پا کے اور فن طب کو اعلیٰ درجۂ کمال پر
پہنچا کے بقراط نے ۳۶۱ء قبل مسیح میں یعنی حضرت مابدولت سے
نو سو اکیس سال پیشتر سفر آخرت کیا۔ کہتے ہیں کہ اس کا مرض موت
فالج تھا۔ مرتے وقت تیمارداروں کو ہاتھی دانت کا ایک ڈبا دیا
اور وصیت کی کہ اُسے میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔ چنانچہ وہ
ڈبا اُس کے ساتھ دفن کر دیا گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی کہ اس میں
کیا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اتفاقاً روم کا قیصر اُس کی قبر پر سے
گذرا اور یہ معلوم کر کے کہ یہ قبر بقراط کی ہے متاثر ہوا اور اس قدر
جوش اُس کے دل میں پیدا ہوا کہ حکم دیا قبر از سر نو بنوا دی جائے۔
اُس لئے کہ مرور زمانہ سے وہ بالکل شکستہ ہو رہی تھی۔ بنانے اور
مضبوط بنیاد قائم کرنے کے لئے قبر کو کھدوا دیا۔ وہ ہاتھی دانت کا
ڈبا ملا۔ قیصر نے اُسے کھول کے دیکھا تو اُس میں ایک چھوٹا سا رسالہ
تھا۔ جس میں پچیس ایسے امراض لکھے ہوئے تھے جن سے انسان
ہرگز نہیں بچ سکتا اور اُن کے ظاہر ہوتے ہی معلوم ہو جاتا ہے
کہ اتنے دنوں اور اتنے زمانے کے بعد مریض مر جائے گا۔ یہ رسالہ

عربی میں ترجمہ ہوا اور عام طور پر ملتا ہے۔ قانونچے کے آخر میں چھپا ہوا ہے۔

انگریز مورخین لکھتے ہیں کہ وہ علم طب کا موجد تھا۔ اسباب مرض پر بہت کامل غور کرتا تھا نسخے میں بہت سادی اور اکثر مفرد دوائیں لکھتا تھا۔

اس اصول کا پہلا مدعی وہی ہے کہ طبیب کو طبیب کی پیروی کرنی چاہیئے وہ طبیب بھی تھا اور جرّاح بھی تھا مگر یونانیوں میں چونکہ مُردوں کی بہت تعظیم کی جاتی ہے لہذا تشریح میں اُس کا علم محدود تھا۔ اُس کے تصانیف کا مکمّل مجموعہ جرمنی میں چھپ گیا ہے۔

بقراط کی اصل میں تیسں کتابیں ہیں جن میں سے دس زیادہ مشہور مرتب اور درس میں داخل تھیں، مگر خیال کیا جاتا ہے اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ یہ سب کتابیں اُسی کی تھیں۔ بلکہ اُنکا اصول و فروع اور تجربات و نسخ کا مجموعہ یہ ہے جو اسقلیبوس سے لے کے اُس کے عہد یعنی تین سو برس تک مرتّب ہوتے رہے اور نہایت مخفی رازوں کی طرح عام نگاہوں سے پوشیدہ رکھے گئے۔ بقراط نے اس فن کے اُن تمام رموز کو یکایک اپنی تحریروں سے ظاہر کر دیا۔

اس کے بعد علم طب کے ماہر اور بتانے والے اُس کے دو بیٹے
دو پوتے ایک بیٹی اور دس۱۰ یا بارہ۱۲ شاگرد تھے جن سب میں
اُس کی بیٹی مالاتا ارسا کو بہت زیادہ کمال اور تبحّر حاصل تھا
اور اپنے باپ کے کمالات کی سچّی وارث وہی تھی۔

جالینوس

یونان کے جو طبیب فن طب کے موجد اور اصلی معلّم تسلیم کیے
گئے ہیں، وہ آٹھ بتائے جاتے ہیں جن میں سے جالینوس سب سے
آخری اور سب سے نہیں تو اُن میں سے اکثروں سے بڑا اور گراں پایہ
ہے۔ مگر اس سبب کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ اُس کے بعد یونانیوں
میں سے کوئی طبیب اور حکیم اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا گو وہ
یونانیوں میں خیال کیا جاتا ہے مگر درحقیقت اُس کا شمار مشکل
سے یونانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ
ایک یونانی خاندان ہی کا چشم و چراغ تھا مگر باعتبار زمانہ
اُس وقت میں پیدا ہوا جب کہ ترقی یونان کا ستارہ غروب
ہو چکا تھا یعنی رومیوں کی عظمت و سطوت نے یونان کی حکمت
ہی کو نہیں بلکہ اُس کے علم و فضل کو بھی پامال کر دیا تھا اور
باعتبار وطن ایشیائے کوچک کے شہر سمرنا کے قریب پیدا ہوا
تھا جو آج دولت عثمانیہ کا ایک ایشیائی بندرگاہ ہے اور جس کے
لحاظ سے بمقابل یورپ والوں کے اہل ایشیا کو اُس پر ناز کرنے
کا زیادہ حق حاصل ہے۔

حضرت مسیح کے بعد جب طیطوس (ٹائٹس) قیصر نے ارض مقدس کو پامال کر کے خاص ہیکل سلیمانی میں آگ لگائی ہے اور یہود کا کُلّیتہً قلع و قمع کر دیا ہے، اُن دنوں ایشیائے کوچک میں ایک یونانی الاصل مہندس رہتا تھا جسے علوم ہندسہ و ریاضی میں بے انتہا دستگاہ تھی۔ ہیئت۔ حساب۔ مساحت اور منطق میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا۔ فلسفہ کا اُسے ذوق تھا اور اہل شہر اُسکی راستبازی وفا کیشی۔ نیاک نفسی و پاکبازی کے معترف تھے۔ اُس کا باپ ایک زبردست مہندس تھا جس نے علم کو عملی حیثیت سے بھی تکمیل کو پہنچایا تھا اور ایک زمانے میں سب سے بڑا مستری اور بڑھیوں کا سردار رہا تھا اور اُس کا دادا علم مساحت میں کامل مانا گیا تھا۔ غرض علم و فضل اور خاصتہً علم ریاضی اُس کے خاندان میں چلے آتے تھے مگر اس ذاتی علم اور خاندانی فضیلت کے ساتھ اپنی زندگی کاشتکاری میں بسر کرتا تھا اور اس میں بھی اُس نے اپنی ذاتی لیاقتوں کے باعث ایک معزز زمیندار کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اسی خوش نصیب شخص کو یہ عزّت حاصل ہے کہ خدا نے اُسے جالینوس کا ایسا نامور بیٹا عطا کیا جو فخر خاندان ہی نہیں بلکہ فخر عالم اور فخر زمانہ ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے دنیا کا سرمایۂ ناز ہے۔

جالینوس کا نام عربی میں آکے زیادہ بگڑ گیا۔ انگریزی تلفظ کے موافق اُس کا نام گے۔ لی۔ نس کلاڈیس ہے۔ مگر یونانی اور رومی زبانوں میں اس کا صحیح تلفظ گائے نوس قلوڈیوس ہونا چاہیئے۔ نام کا دوسرا لفظ تو عربوں نے غالباً غیر مانوس ہونے کی وجہ سے مطلقاً چھوڑ دیا۔ پہلے لفظ کو موجودہ اصول کے موافق اگر صحیح طور پر معرّب کیا جاتا تو قالے نوس ہوتا مگر قدمائے عرب کا یہ قاعدہ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ گ کو ج سے بدلا کرتے تھے اور اسی قاعدے کے مطابق اُنھوں نے "گالے نوس" کو "جالینوس" بنا دیا۔ اس لفظ کے معنی یونانی زبان میں ہدایت کرنے والے اور زہیر کے ہیں۔ بعض علمائے عرب نے اس کے معنے فاضل کے بتائے ہیں۔ مگر صحیح پہلا ہی خیال ہے۔

جالینوس کی ولادت ایشیائے کوچک کے ایک مغربی شہر میں ہوئی جو قسطنطنیہ سے مشرق و جنوب جانب فی الحال اناطولیا کے علاقے میں ہے۔ اس شہر کا نام اہل عرب فرغامس بتاتے ہیں اور انگریزی مورّخین کے نزدیک پرگاموس ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے بعض قدما کے حوالے سے لکھ دیا ہے کہ شہر فرغامس وہی شہر ہے جس کو سمرنا کہتے ہیں۔ سمرنا آجکل ایک بہت مشہور شہر ہے اور

دولت عثمانیہ کا ایک بہت بڑا ایشیائی بندرگاہ ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اِسی شہر کا نام اُن دنوں فرغامس تھا۔ سمرنا سے تقریباً ۳۰ یا ۳۵ میل کے فاصلے پر رومیوں اور یونانیوں کے زمانے میں پرگالم نام کا ایک بڑا شہر موجود تھا جو آجکل بھی ہے اور اب پرگامو کہلاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ شہر گاموس ہے جس کو جالینوس کا وطن ہونے کی عزّت حاصل ہے۔ ہارون الرشید کے مشہور طبیب دربار جبریل بن بختیشوع کا بیان ہے کہ جب ہارون الرشید نے رومیوں کے ملک پر حملہ کیا اور بڑھتے بڑھتے جا کے شہر قرہ میں ٹھہرا تو میں نے عرض کیا کہ ہمارے اُستاد فن جالینوس کا وطن یہاں سے دو ہی فرسخ ہے۔ اجازت ہو تو میں جا کے زیارت کر آؤں اور اُن کے مکان کی جگہ پر بیٹھ کے کچھ کھاؤں پیوں تاکہ اپنے معاصر طبیبوں پر مجھے اس بات پر فخر کرنے کا موقع مل جائے کہ میں نے خاص جالینوس کے گھر میں بیٹھ کے کھایا پیا ہے۔ رشید نے کہا کہ دشمن کا ملک ہے اور رومی سپاہی آس پاس لگے ہوئے ہیں تم کو پکڑ لے جائیں تو کیا کرو گے میں نے عرض کیا سطوت خلافت ایسی نہیں کہ کسی کو پاس پھٹکنے کی بھی جرأت ہو سکے بھلا رومیوں کی مجال ہے کہ مجھ پر ہاتھ ڈالیں۔ رشید بولا تاہم احتیاط شرط ہے اور حکم دیا کہ پانسو سوار میرے ہمراہ جائیں میں نے

گھبرا کے کہا کہ پچاس آدمی کافی ہیں۔ اس پر رشید ہنسا اور کہا میں سمجھا ڈرتے ہو کہ اتنے لوگوں کو کھلانا پڑے گا۔ اچھا نواب تمہارے ساتھ ایک ہزار جوان جائیں۔ اب میں نے مایوسی کے لہجہ میں افسردہ ہو کے کہا۔ معلوم ہوتا ہے جالینوس کے وطن کی زیارت میری قسمت میں نہیں ہے۔ حضور میں جانے ہی سے باز آیا۔ اس پر رشید اور زیادہ ہنسا اور اپنے باپ مہدی کی قسم کھا کے کہا۔ تم جاؤ گے اور ہزار جوان تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ غرض جبریل جبراً و قہراً اسی شاہی جلوس کے ساتھ گیا۔ جالینوس کے مکان کا پتہ لگایا اور اس میں بیٹھ کے کھانا کھایا۔ جبریل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ تقریباً سات سو برس گزر گئے تھے۔ مگر اُس وقت تک وہاں جالینوس کے مکان کے کھنڈر موجود تھے جن کی حالت و وسعت بتا رہی تھی کہ کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کا نمونہ ہوں گے۔

جالینوس کے سنہ ولادت میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جالینوس نے اپنی کتابوں میں اپنے اور اپنے زمانے اپنی عمر اور اپنے عہد کے فرمانرواؤں کے حالات نہایت ہی توضیح سے بتائے ہیں تو اس اختلاف پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائی کاتبوں اور ناسخوں سے بعض غلطیاں ہو گئیں۔

جن کی وجہ سے سنین کے حسابات میں فرق پڑنے لگا اور مورخین عرب نے جو اختلاف روایات کے نقل کرنے میں بڑے مشتاق ہیں اُس کی بنیاد پر ایسی ایسی پیچیدگیاں پیدا کیں کہ جالینوس کسی کے نزدیک تو حضرت مسیح کا معاصر تھا کسی کے خیال میں پچاس ساٹھ برس بعد اور کسی کے نزدیک دو سو برس بعد۔ غور کرنے سے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۳۰ء میں وہ پیدا ہوا۔

یحییٰ نحوی نے جس طرح دیگر حکمائے یونان کی عمروں کو مختلف مشاغل میں تقسیم کرکے بتایا ہے اُسی طرح جالینوس کی نسبت بھی لکھ دیا کہ ۸۷ برس زندہ رہا۔ جس میں سے ۱۷ سال بچپن اور طالب علمی میں صرف ہوئے اور ۷۰ برس تک ایک گراں پایہ عالم و فاضل اور مرجع انام رہا۔ مگر ایسی باتوں میں بجائے تاریخی اعتبار کے کہانی کی شان ہوتی ہے اس تقسیم کی تردید خود جالینوس کے بیان سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ لکھتا ہے کہ سترھویں برس میرے والد نے مجھے طب کی تعلیم دلانی شروع کی اور اسی وجہ سے علامہ ابن اصیبعہ نے بھی نحوی پر اعتراض کیا ہے۔ جالینوس چونکہ ایک شریف اور صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوا تھا لہذا باپ کو اُس کی تعلیم کی بے انتہا فکر تھی اور یہ خیال زندگی کے تمام خیالات سے زیادہ اُس کے دل میں

جاگزیں تھا۔ وہ ہونہار بیٹے کے اُستادوں اور معلّموں پر اپنا
روپیہ صرف کرتا تھا۔ بلاد دور و دراز سے لایق و مشہور لوگوں کو بلاتا
تھا اور بیٹے کو اُن کی تربیت میں دیتا تھا مگر چونکہ خدا کو منظور تھا
کہ باپ کی یہ توجہ اور محنت بارآور ہو لہذا بیٹے کے دل میں بھی علم کا
شوق ڈالدیا اور وہ علم کی طرف اس ذوق وشوق سے دوڑتا تھا
جیسے پروانہ شمع کی طرف یا پیاسا پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ اُستاد سے
سبق لینے کے بعد گھر آتا تھا تو کسی چیز کی طرف نظر نہ دوڑاتا بلکہ
راستے بھر اپنا سبق یاد کرتا آتا۔ چنانچہ معمول تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے
اُسے سبق یاد ہو جاتا۔ ساتھ والے اور ہم سبق اُس کی اِن باتوں
کو دیکھ کے حیران رہ جاتے تھے۔

ابتداً باپ نے اُسے اُنھیں علوم کی تعلیم دلانی شروع کی
جو اُس کے خاندانی علوم تھے یعنی ہندسہ۔ حساب۔ ریاضی وغیرہ
چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اپنے سن صبا میں میں نے علم برہان کی تعلیم
پائی۔ جن کے لئے بعض اوقات اُس کے باپ کے دست شفقت
سے مار بھی کھائی اور اسی ذاتی شوق اور قابلیت فطری کی برکت
تھی کہ پندرھویں برس اِن سب سے فراغت حاصل کرکے اُس نے
علم منطق شروع کر دیا تھا کہ علوم فلسفہ کی طرف توجہ کر سکے۔ اِس

مشغلہ میں جو اُن دنوں نہایت ہی متبرک اور مذہبی مشغلہ خیال کیا جاتا تھا دو ہی سال مشغول رہنے پایا تھا کہ اُس کے باپ نے اتفاقاً کوئی خواب دیکھا جس نے اُس سن رسیدہ یونانی مہندس پر کچھ ایسا اثر پیدا کیا کہ فوراً بیٹے کی تعلیم کے متعلق اُس کے اغراض و مذاق میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا۔ یا تو منطق و فلسفہ پڑھا رہا تھا یا بیٹے کو طب کی تعلیم دلانی شروع کی اور جس وقت سے جالینوس نے فن طب کی طرف توجہ شروع کی ہے اُس وقت اُس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ مگر اس فن میں اُسے کچھ ایسا مزہ ملا یا علوم روحانی و فلسفہ کی طرح علم طب نے اُس پر بے وقعتی عالم کا ایک ایسا خاص اثر ڈالا کہ اُس نے اس کم سنی و عنفوان شباب کے زمانے ہی میں لذائذ دنیوی کو ایک قلم چھوڑ دیا۔ اور لوگوں کے دلوں میں جن چیزوں کی ہوس ہوا کرتی ہے اُن سب کو ذلیل اور اپنی شان سے ادنےٰ خیال کرنے لگا۔ اُف اُس نے بہانتک فروتنی اختیار کی کہ اپنے آپ کو نہایت ہی ذلیل درجے پر دکھاتا تھا۔ رات رات بھر جاگتا اور اُن علمی خزانوں کی فکر میں رہتا جو حکماء و اطبّائے قدیم کے ورثہ اور ترکہ تھے چونکہ وہ ایک بیمثل و بے ہمتا طبیب تھا لہذا اپنی زندگی کو بھی اُس نے طبّی حیثیت

سے اور صحت و مرض کے لحاظ سے بتایا ہے چنانچہ اُسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُس کا عنفوانِ شباب تھا اور لذائذ دنیوی سے وہ بہت کچھ احتراز کرنے لگا تھا۔ اُس کے والد نے اُسے تو تعلیم پانے کے لئے شہر میں چھوڑ دیا اور خود اُس قریب کے گانوں میں جا کے اقامت پذیر ہو گئے جہاں اُن کی زمینداری اور کھیتی تھی۔ باپ سے جُدا ہونے کے زمانے میں بعض ہم سنوں اور ہم سبقوں سے اُس سے صحبت بڑھی۔ چونکہ ذاتی شوق اور نہ تھکانے والی محنت کے باعث وہ ہمیشہ ہم عمروں اور ہم سبقوں پر غالب رہتا تھا اور درس میں اُن سے آگے نکل جاتا تھا۔ لہذا یہ لازمی بات تھی کہ ہم سن زیادہ شوق سے بلکہ اپنا فخر سمجھ کے اُس سے ملا کرتے تھے۔

اُنھیں دوستوں میں کسی دن میوہ خوری کی صحبت ہوئی اور جالینوس نے اپنی عادت کے خلاف خوب پیٹ بھر کے اور تن کے کھایا۔ اُس وقت تو صحبت لطف و مذاق میں ٹل گئی مگر چند روز بعد جب موسم خریف شروع ہوا تو وہ بیمار ہو گیا اور ایسا سخت بیمار ہوا کہ بغیر فصد کھولے جانبر نہ ہو سکا۔ اس بیماری کو وہ اپنی اُسی میوہ خوری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ باپ کو خبر ہوئی تو بیتاب ہو کے

دوڑا آیا۔ اُسے اُسکی بد پرہیزی پر لعنت ملامت کی۔ ڈانٹا ڈپٹا اور
کہا۔ بھلا تم خیال تو کرو۔ تمھارے بچپن میں غذاؤں کے متعلق
کیسی کیسی احتیاطیں کی جاتی تھیں اور پرہیز کا کس قدر لحاظ رکھا
رکھا جاتا تھا۔ خبردار پھر کبھی دوستوں میں بیٹھ کے ایسی بے احتیاطی
نہ کرنا۔ غرض خدا خدا کر کے اُس بیماری سے اچھا ہوا اور غذاؤں
کے متعلق پوری احتیاط کو عمل میں لانے لگا۔ اِس پہلی بیماری کے
وقت اُس کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اِس واقعہ کو ایک ہی برس گزرا
تھا اور اُس کی عمر کا بیسواں سال تھا کہ شفیق باپ اس عالمِ فانی
سے رخصت ہوا اور جالینوس کا وہ مہربان ہمدرد دنیا سے اُٹھ
گیا جو اُس کی تمام فکروں کو اپنے سر لئے ہوئے تھا اور جس کی وجہ
سے اُسے کبھی کسی قسم کی فکرِ معاشرت سے سابقہ نہیں پڑنے پایا تھا۔
جس کی پہلی مضرت یہی برداشت کرنی پڑی کہ دوستوں کی
ناعاقبت اندیشی سے پھر ایک مرتبہ میوہ جات کے استعمال میں
پہلی ہی سی بد پرہیزی کی۔ وہی پہلی سی بیماری پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور
پھر فصد لینی پڑی۔ مگر اب کی مرتبہ کی بیماری نے زیادہ ستایا اگرچہ
فصد لینے سے بیماری کا زور ٹوٹ گیا مگر سلسلہ مرض کئی سال تک
چلا گیا اور عموماً یہ حالت تھی کہ کبھی بیمار ہو جاتا اور کبھی اچھا ہوتا۔

یہاں تک کہ ۲۸ برس کی عمر کو پہنچ گیا۔ اُس زمانے میں اُسے ایک بہت سخت مرض برداشت کرنا پڑا جس سے بڑی ناامیدیوں کے بعد خدا نے اُسے نجات دی۔ یہ مرض ایک پھوڑا تھا جو جگر کے قریب نکلا تھا اور ایسا سخت تھا کہ اُس زمانے کے مذاق و عقائد کے مطابق اُس نے منت مانی تھی کہ اگر شفا حاصل ہو گئی تو اُس ہیکل یعنی مندر کی زیارت کروں گا جو اسقلیبنوس کا مندر کہلاتا تھا اور اس منت کو اُس وقت پورا کیا جب قیصر روم اُسے اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے جانا چاہتا تھا اور اُس نے اُسی منت کا عذر پیش کر کے اپنی جان چھڑائی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسقلیبنوس جو یونان کا پہلا طبیب تھا اُس کے نام کا ایک مندر قیاصرۂ روم کے دور اور حضرت مسیح کے زمانے کے بعد تک موجود تھا اور اُس کی زیارت اسقلیبنوس کے کمالات کے لحاظ سے موجب صحت خیال کی جاتی اور مریض صحت پانے کے لئے اُس کی زیارت کرتے اور چڑھاوؤں کی منت مانا کرتے تھے۔ وہ ہیکل اگرچہ بُت پرستی کا ایک کرشمہ ہو گی مگر پھر بھی ایک بڑے نامی گرامی اور گراں پایہ طبیب کی یادگار تھی مگر افسوس کہ مسیحیت نے جس طرح یونان و روم

کے قدیم علم و فضل کی اور تمام یادگاروں کو تہ و بالا کر کے دنیا سے مٹا دیا اُسی طرح اس ہیکل کو بھی فنا کر دیا۔

بہر تقدیر اس سخت بیماری کے بعد پھر جالینوس نے عہد کیا اور قسم کھائی کہ اب انجیر اور انگور کے سوا کسی پھل کو کبھی نہ کھاؤں گا اور انجیر و انگور کو کھاؤں گا بھی تو بخوبی اندازہ کر کے اور خوب دیکھ بھال کے کہ وہ پکّے ہیں اور خراب نہیں ہوئے ہیں۔ اُس کے ساتھ اُس کے تمام دوستوں اور ہم عمروں نے بھی قسم کھائی۔ جس کا فائدہ بھی وہ یہ بتاتا ہے کہ میں پھر کبھی بیمار نہیں ہوا۔

عمر کے اٹھائیسویں برس اس مرض شدید میں مبتلا ہوا تھا اور غالباً اب وہ فن طب میں بھی اپنی تعلیم کو پورا کر چکا تھا۔ کیونکہ اُسکے دو ہی سال بعد اپنی عمر کے تیئسویں[۲۳] برس ایک معزز و محترم طبیب کی حیثیت سے وہ شہر رومۃ الکبریٰ میں پہنچا۔ رومہ کا ان دنوں زمانہ عروج پر تھا۔ قیصروں کی عظمت و جبروت کی کوئی انتہا نہ تھی اور جس طرح سوا ایران کے مغربی ایشیا اور سارے یورپ و افریقہ کے تمام ممالک سلاطین رومہ کے آگے سر اطاعت جھکائے ہوئے تھے اُسی طرح ساری دنیا کے کُل علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا مرجع بھی رومۃ الکبریٰ ہی تھا۔ وہاں بڑے بڑے علما و فضلا ایک سے ایک

بڑھ کے کامل فن، روشن خیال، فلسفی اور حاذق طبیب جمع تھے، جن کے مقابل میں کسی نئے شخص کا آ کے کسی فن میں دعوے کرنا اور شہرت و ناموری حاصل کرنا اور خصوصاً ایسے شخص کا جو نوعمر و نوخیز ہو نہایت دشوار بلکہ غیر ممکن کے درجے کے قریب پہنچا ہوا تھا مگر جالینوس ہی تھا جس نے وہاں پہنچنے کے چند ہی روز بعد سب کو دبا لیا اور ایسی شہرت حاصل کی کہ وہی وہ تھا۔

جس وقت وہ رومۃ الکبریٰ میں پہنچا ہے مرقوس اوریسالیوس فطونی توس قیصر کا ابتدائی دور تھا اس لئے کہ وہ سنہ ۱۶۱ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ چونکہ جالینوس تقریباً سنہ ۱۳۰ء میں پیدا ہوا تھا اور عمر کے تیسویں برس یہاں آیا جس حساب سے اُس کے ورود روما کا سال سنہ ۱۶۲ء قرار پاتا ہے۔ یہ کمی شاید مہینوں کی کمی زیادتی سے پوری کی جا سکے مگر اس میں شک نہیں کہ جس وقت وہ پہنچا ہوگا موجودہ قیصر کی تخت نشینی کا پہلا ہی سال اور بالکل ابتدائی زمانہ ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ورود روما کے ابتدائی زمانے ہی میں اُس نے ایک مرتبہ کسی رومی افسر کے سامنے مقدس اطبائے روم کو جمع کیا۔ پھر ایک جانور کو منگوا کے اُس کا پیٹ چاک کر ڈالا آنتیں وغیرہ باہر

نکالیں اور سب سے کہا جس طرح یہ سب اعضائے اندرونی پیٹ کے اندر تھے انھیں آپ پھر اندر رکھ دیجئے اُن سب کے لئے یہ ایک ایسا نیا کام تھا کہ کسی کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی اور جب سب عاجز ہو گئے تو اُس نے سب کے سامنے وہ آنتیں وغیرہ حسب سابق مرتّب کر کے رکھ دیں۔اس کے بعد اُس نے ایک اور زندہ جانور منگوا کے اُس کی چند رگیں کاٹ دیں اور جب اُن سے خون کے فوّارے جاری ہوئے تو اطبّائے حاضرین سے کہا اس کا علاج کیجئے۔ یہ خون رُک جائے اور رگیں جُڑ جائیں مگر اب بھی کسی سے کوئی تدبیر نہ بن پڑی تب اس بارے میں بھی اُس نے اپنا یہ کمال دکھایا کہ اُن لوگوں کے سامنے ہی خون روک دیا اور رگیں جوڑ دیں۔ یہ واقعہ حاضرین پر غیر معمولی اثر ڈالنے اور انھیں معتقد بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اُسی افسر نے جس کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا اپنے ایک فوجی شفا خانے پر اُسے مقرر کر دیا۔ جالینوس نے اُس دارالشفا میں ایسی توجہ و ہوشیاری سے کام کیا کہ اوّل تو تین سن رسیدہ اور تجربہ کار طبیبوں کا بار اپنے سر اُٹھا لیا اور اس کامیابی سے علاج کیا کہ پیشتر والے اطبّا کی نگرانی میں ۱۶- آدمی مرے تھے اور جالینوس کی نگرانی کے وقت اُتنی ہی تعداد میں سے صرف دو آدمی مرے باقی سب اچھے ہو گئے۔ اس کامیابی کی شہرت ہوئی تو

تو ایک بڑے شفاخانے کا کام اُس کے سپرد کر دیا۔ یہاں جالینوس نے اُس پہلے شفاخانے سے بھی زیادہ مستعدی دکھا کے کامیابی حاصل کی یعنی باوجودیکہ لوگ بہت شدید زخمی تھے اور متعدد کاری زخموں کے گھائل تھے مگر اُس کی غیر معمولی توجہ سے سب جانبر ہو گئے۔

انھیں چیزوں نے اُسے اس قدر مشہور کر دیا کہ قیصر روم الطونی نوس کے دربار تک باریابی کی عزت حاصل ہوئی اور بوائیتھوس نام کا ایک عالی مرتبہ رومی امیر کے لئے جو خاص رومتہ الکبریٰ کا حاکم تھا۔ علم تشریح میں ایک کتاب لکھی اور روز بروز شہرت و ناموری ہی حاصل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اب روم میں اُس کے مقابل کا کوئی طبیب نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ روم میں اُس کی ناموری و شہرت کا ایک یہ ذریعہ بھی تھا کہ وہ مجمع عام میں علم تشریح پر لکچر دیا کرتا تھا جس سے سب لوگ اس علم و فضل کے نہایت ہی معترف ہو گئے تھے حتیٰ کہ خود بادشاہ نے اپنی غیبت میں اپنے بیٹے کی صحت کا نگراں اور اُس کا معالج اُس کو مقرر کیا۔

ایسی ناموری، ایسی مقبولیت، ایسی عزت اور اس درجے کا تجربہ حاصل ہونے کے بعد اُس نے غور سے دیکھا تو اُن دنوں اطبائے سوفسطائی کا زور و شور تھا جو محض اوہام اور مغالطوں میں مبتلا تھے۔

اور فن طب کو روز بروز غارت کرتے جاتے تھے۔ یہ چیز اُسے سخت ناگوار
ہوئی اور خیال کیا کہ فن طب کو زمانے کی اس دست بُرد سے بچانا
میرا سب سے بڑا اور اہم فرض ہے۔ اس بات کا خیال آتے ہی وہ
اطبائے زمانہ کی مخالفت پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ صرف بقراط اور اُس کے
پیروؤں کے اصول کو اختیار کر لیا۔ اُن کی تائید و تقویت کی اور جو
لوگ اُس قدیم صحیح ڈھرّے سے ہٹ گئے تھے اُن کو ملزم ٹھہرایا اور
اُن کی غلطیاں پکڑنی شروع کیں۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اطبّائے زمانہ
سے مخالفت بڑھی، جھگڑے پیدا ہوئے اور بار بار مناظرے اور ردّ و
قدح کی نوبت آئی جن میں مقبولیت اور تجربہ نے ہمیشہ جالینوس ہی
کو کامیاب کیا۔

رومتہ الکبریٰ میں یہ تمام کمالات اُس نے چند ہی روز میں دکھا
دئے اور وہاں صرف تین سال کے قیام نے اُسے نہایت ہی شہرت و
عروج کے درجے پر پہنچا دیا۔ اس لئے کہ اپنی عمر کے تیسویں سال
رومہ میں گیا تھا اور تینتیسویں برس واپس چلا آیا اور ارادہ تھا کہ وطن
میں بیٹھ کے اہل وطن کی خدمت کرے یا دیگر ممالک میں سفر کر کے
اپنے علم و فن میں زیادہ کمال حاصل کرے۔

شہر رومتہ الکبریٰ کے اس پہلے قیام ہی کے زمانے میں

اُس نے پوری شہرت و ناموری حاصل کر لی تھی۔ ایسی شہرت کہ رومہ کا کوئی طبیب اُس کے مقابل میں نہ ٹھہر سکتا تھا۔ منجملہ اُن شفاخانوں کے جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے اُس نے مذہبی دارالشفار میں بھی کمالات دکھائے تھے۔ وہاں کوئی بہت بڑا مندر تھا جو مذہبی حیثیت سے مرجع عالم بنا ہوا تھا۔ وہاں کے سب سے بڑے پوجاری نے جو تمام اہل روم کا مقتدا اور پیشوا تھا قدر کی اور اِسی مندر کے متعلق جو زبردست شفاخانہ تھا اُس کی نگرانی اور اُس کے مریضوں کا علاج اُس نے جالینوس کے ذمّے کیا۔ یہاں اُس طبیب بے ہمتا نے طبّی کمالات کے ساتھ جوشِ عقیدت سے بھی کام لیا اور ایسی توجہ و سرگرمی ظاہر کی کہ لوگ کہتے ہیں رومہ میں اُس کی شہرت و ناموری کا ذریعہ یہی شفاخانہ ہوا۔

اپنی کتاب تشریح میں اُس نے جو حالات خود بیان کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ رومتہ الکبریٰ میں تین سال رہ کے بہت سے ارادے اور آرزوئیں دل میں لئے ہوئے وہ واپس تو چلا آیا مگر شاید چند روز بھی اطمینان سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا۔ اُن دنوں روم کے دو قیصر رہا کرتے تھے جو دونوں اتفاق سے کسی مہم کے سر کرنے کے لئے شہر اقولیا میں آ کے فروکش ہوئے۔ جالینوس کے کمالات

کے وہ پیشتر سے معترف ہو چکے تھے اور اُن کی نظر میں اس سے بڑا
کوئی طبیب نہ تھا۔لہذا فوراً شاہی فرمان اُس کی طلبی میں پہنچا۔جالینوس
چونکہ محنت سے تھک کے آیا تھا اور دیگر ممالک میں سفر کرکے تجربات
طبّی میں ترقی کرنے کا دلدادہ ہو رہا تھا لہٰذا اب قیاصرہ کے دربار سے
بھاگتا تھا مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات' عذر کرنا بے سود تھا' طوعاً و کرہاً
اقولیا کی راہ لی اور حاضر دربار ہو گیا۔ لیکن اب بھی اُسے دل میں اُمید
تھی کہ ان دونوں قیصروں میں سے ایک رحمدل اور قدردان ہے
اگر اُس کے سامنے عذر خواہی کروں گا تو واپسی کی اجازت مل جائے گی۔
اتفاق کی بات جالینوس اقولیا میں پہنچا ہی تھا کہ وبا شروع ہو گئی اور
لوگ بیمار ہو ہو کے مرنے لگے۔ خود اُس کا بیان ہے کہ یہ وبا ایسی شدید
تھی کہ اس سے پیشتر کبھی نہیں سُنی گئی تھی۔ دونوں قیصروں نے تو
بے تحاشا بھاگ کے رومۃ الکبریٰ کی راہ لی اور لشکر اقولیا ہی میں
پڑا رہا۔ مگر موت گویا اُن قیصروں کے پیچھے دوڑتی چلی آتی تھی۔
نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے ایک راستہ ہی میں بیمار پڑ کے مر گیا اور دوسرا
اُس کی لاش کو لئے ہوئے رومہ میں پہنچا جہاں اپنے شریک سلطنت
کی خاک کو خاک رومہ کے سپرد کرکے اُسے اطمینان نصیب ہوا مگر
رومہ میں چند ہی روز ٹھہرنے کے بعد اُس نے ایک مہم پر روانہ ہونیکی

تیاریاں کر دیں۔ جالینوس اس پورے سفر میں اُس کے ہمراہ رکاب تھا اور واقعات ایسے پیش آتے گئے کہ اُسے واپسی کی اجازت حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب قیصر روم ایک عظیم الشان مہم پر اور معرکہ آرائی کے ارادے سے جانے لگا تو جالینوس کو بھی ہمراہ رہنے کا حکم دیا اور اس بات کی استمالت شروع کی کہ وہ میدان جنگ میں جا کے شاہی طبیب کی خدمت بجالائے۔ جالینوس نے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یہ عذر پیش کیا کہ مجھے اپنی یہ منّت پوری کرنی ہے کہ اسقیلبنوس کے مندر کی زیارت کروں اور وہاں کے رسوم زیارت کو بجالاؤں۔ قیصر نے جب دیکھا کہ جالینوس اس نازک سفر میں ساتھ نہیں دیتا تو کہا اچھا تم ساتھ نہ چلو اور تمھیں اجازت ہے کہ اپنی منّت بھی پوری کرو مگر وطن واپس جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ میں روم میں واپس نہ آجاؤں۔ تم ہمارے دارالسلطنت ہی میں ٹھہرے رہنا اور اگر یہیں نہیں تو میری غیبت میں میرے بیٹے کے معالج رہنا۔ الغرض یہ حکم دے کے قیصر انطبنوس لڑائی پر چلا گیا اور جالینوس کے پاؤں میں بدستور بیڑیاں پڑی رہیں۔ اب اُس کی شہرت اس درجے کو پہنچی ہوئی تھی کہ لوگ اُس کے نام سے ناجائز تمتع حاصل کرنے کی کوشش کرتے

تھے چنانچہ ایک دن وہ روما کی سڑک پر چلا جاتا تھا کہ دیکھا ایک مقام پر غیر معمولی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور لوگ کسی بیرونی شخص کو گھیرے کھڑے ہیں جالینوس اس تجسس میں کہ یہ کیا معاملہ ہے بھیڑ کے اندر گھسا اور اُس شخص کے پاس پہنچ کے اُس کی باتیں سُننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا میں ملک شام کے شہر حلب کا رہنے والا ہوں اور جالینوس کا شاگرد ہوں۔ مجھے یہ ایک مجرب دوا اُس سے خاص طور پر ملی ہے جو اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ یہ کہہ کے وہ تو خاموش ہو گیا مگر جالینوس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی صورت دیکھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے اور اس سے کبھی کی شناسائی بھی ہے یا نہیں۔ ہزار غور کیا اور حافظے پر زور ڈالا مگر یاد نہ آیا تب وہ کھڑا ہو کے اُس کے علاج اور اُس کی تدابیر دفع مرض کو غور سے دیکھنے اور سُننے لگا۔ چند ہی لمحوں میں معلوم ہو گیا کہ وہ محض ایک دغاباز شخص ہے اور شاگرد ہونا کیسا فن طب سے مس بھی نہیں رکھتا تو آگے بڑھا اور لوگوں سے کہا یہ شخص بالکل جھوٹا اور جعل ساز و مکار ہے میں خود جالینوس ہوں اور کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ اِتنا سُنتے ہی لوگ اُس پر جھپٹ پڑے اور گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد جب وہ جعلسازی کے جُرم کا مُرتکب قرار دے کے دربار شاہی میں پیش کیا گیا تو اُسے

سزادی گئی۔

اس قسم کے جعل ساز ہر زمانے میں اور ہر فن کے مدعیوں میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے دور اولین میں جب فن حدیث ترقی کر رہا اور تنقید و تحقیق کی سرگرمیوں نے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے سے باکمال نقادِ فن اور محدث پیدا کر دیے تھے۔ تو ایک دن کا واقعہ ہے کہ بصرہ کی جامع مسجد میں یہ دونوں بزرگ نماز سے فراغت کر کے اور درود وظائف میں مشغول تھے کہ ناگہاں ایک شخص آیا جس نے نماز پڑھی اور کل حاضرین مسجد کی طرف مخاطب ہو کے بآواز بلند کہنے لگا حدثنا یحییٰ ابن معین و احمد بن حنبل عن فلان عن فلان قال قال رسول اللہ الخ یعنی مجھ سے یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نے فلاں فلاں لوگوں کے سلسلے سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے اس سے ایک چڑیا پیدا ہوتی ہے، اس کی چونچ ایسی ہوتی ہے، اور پر ایسے ہوتے ہیں اور ہر پر سے فرشتے وابستہ ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس نے ایک بہت بڑی حدیث کئی ورقوں کی کہانی کی شان سے بیان کر ڈالی۔ خود یہ دونوں بزرگ جن سے وہ روایت بیان کرتا تھا حیران تھے

کہ یہ کیا معاملہ ہے آخر دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ
تم نے اس حدیث کی روایت بیان کی ہے اور دونوں نے کانوں
پر ہاتھ رکھا۔ تب یحییٰ بن معین نے اُس شخص کو اشارے سے
اپنے پاس بلایا اور پوچھا تم سے یہ حدیث کس نے بیان کی جواب ملا
یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نے۔ اُس شخص نے ان دونوں ائمہ
حدیث کے صرف نام سُنے تھے پہچانتا نہ تھا۔ اُس کا یہ جواب سُن کے
یحییٰ ابن معین نے کہا میں یحییٰ ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں۔ مگر
ہم دونوں نے تو اس حدیث کو کبھی نہیں سُنا تمھیں اس حدیث کی
روایت کیونکر پہنچ گئی۔ مگر سچ یہ ہے کہ یہ عربی مکار اُس جلبی مکار سے
جس سے جالینوس کو سابقہ پڑا تھا زیادہ جری اور چالاک تھا۔ وہ
تو لاجواب ہو کے روم کی عدالت سے سزایاب ہوا مگر اس نے
تفضیح کی پروا بھی نہ کی بلکہ یحییٰ بن معین کی زبان سے یہ کلمات
سُنتے ہی قہقہہ مار کے ہنسا اور نہایت ڈھٹائی سے بولا میں سُنا
کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین بے وقوف ہیں آج اس کا تجربہ ہو گیا۔
آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ دنیا میں اکیلے آپ ہی یحییٰ بن معین ہیں
اور یہی احمد بن حنبل۔ ممکن ہے کہ میں نے کسی اور یحییٰ ابن معین
اور دوسرے احمد بن حنبل سے روایت کی ہو۔ اس جواب پر بیچارے

یحییٰ بن معین تو اُس کا مُنہ دیکھ کے رہ گئے اور وہ ہنستا ہوا جامع مسجد سے نکل کے چلا گیا۔ جالینوس جب دوسری مرتبہ شہر رومہ میں داخل ہوا ہے۔ اُس کی عمر ۳۷ برس کی تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ واردِ روم ہونے سے پہلے اپنے علمی شوق میں اُس نے دو بحری سفر کئے تھے ایک مرتبہ تو قورنطوس (کارنتھ) میں گیا جہاں اُس نے سُنا تھا کہ زمانہ کا سبق کے ایک مشہور طبیب قونطس کا کوئی شاگرد وہاں موجود ہے جس کا نام افیقانوس ہے۔ مزید طبی واقفیت حاصل کرنے اور اُس کے خاندانی کمالات سے بہرہ یاب ہونے کے لئے وہ کارنتھ میں گیا اور اُس کی شاگردی کی عزت حاصل کی۔

اسی طرح یہ سُن کے قونطس اور نومیسیانوس کے کچھ تلامذہ اسکندریہ میں موجود ہیں۔ اُس نے ارضِ مصر کا سفر کیا اور اُن لوگوں سے مل کے اور اُن کے خزانہ ہائے علمی سے طبی دولت حاصل کر کے اپنے وطن کو واپس آیا۔ اسی موقع پر اُس نے گھر میں بیٹھ کے آزادی کے ساتھ علم طب کی خدمت گذاری پر کمر باندھی ہی تھی کہ قیصران روم نے اُسے اقولیا میں طلب کیا۔ جس سلسلے میں اُسے دوبارہ رومتہ الکبریٰ کی صورت دیکھنی پڑی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ انھیں سفروں کے سلسلے میں اُس نے قدیم دارالسلطنت روم شہر اثینیہ

(اتھنز) کا بھی سفر کیا تھا۔اُس کے اساتذہ یوں تو بہت ہیں مگر اُس کا اصلی اُستاد جس سے اُس نے علم طب کو تکمیل کے ساتھ حاصل کیا اریبنس نام کا اُس عہد کا ایک مشہور طبیب اور اُن دنوں قلعہ بطرہ (کلیوپیٹرا) نام کی ایک باکمال عورت تھی جو عورتوں کے محض علاج میں مشہور تھی طب کے اس مخصوص حصّہ کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے اس عورت کی بھی شاگردی کی۔

اُس کے شوق علم اور تحقیق و تفتیش کا اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ محض اتنی غرض کے لئے کہ بعض معدنی ادویہ کو اُن کے اصلی معدن میں دیکھے اور اُن کا تجربہ کرے۔اُس نے جزیرہ قبرس (سائپرس) کا سفر کیا۔اسی دھن میں جزیرہ ملنوس میں پہنچا پھر ارضِ سام میں آیا۔جو سرزمین کہ اپنی قدامت اور اپنے روحانی و الہامی کمالات کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔اس ملک میں بھی اُس نے بہت سے طبّی تجربات حاصل کئے اور ارادہ تھا کہ سفر کرتا ہوا اپنے وطن کو واپس جائے۔راستے میں شہر فرعا میں پہنچا جو میڈیٹرینین سی (بحیرۂ روم) کے سواحل پر تھا۔یہاں پہنچتے ہی ناسازیِ آب و ہوا نے کچھ ایسا اثر کیا کہ بیمار ہوا اور اسہال کی شدّت ہوئی۔

خود طبیب حاذق تھا اور بعض طلبا بھی گرد و پیش موجود تھے۔

سب نے علاج میں بہت زور لگایا مگر کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ علاج کی بے اثری نے چند ہی روز میں یقین دلا دیا کہ یہ جانے والا مرض نہیں بلکہ مرض موت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض لوگ معترض بھی ہوئے کہ بڑی بڑی سخت بیماریوں کا علاج کیا اور اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اُن لوگوں کا اطمینان کرنے کے لئے اُس نے ایک مٹکا منگوا کے اس میں پانی بھروایا پھر ایک دوا اُس میں ڈلوادی اور تھوڑی دیر بعد لوگوں سے کہا مٹکے کو توڑ ڈالو وہ توڑا گیا تو دیکھا پانی منجمد ہو گیا تھا جو بیضوی قطع میں بستہ ہو کے رہ گیا اور مٹکے کے ٹھیکرے ٹوٹ کے الگ گر گئے لوگوں نے اس پر حیرت ظاہر کی اور اُس نے کہا اسی دوا کو جس کا تم نے یہ اثر دیکھا بہت کچھ استعمال کر چکا ہوں مگر دست نہیں رکے خلاصہ یہ کہ اسی شہر فرعا میں جو علاقہ مصر میں ہے اس نامی گرامی طبیب نے دنیا کو رخصت کیا اور وہیں پیوند زمین ہوا بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ اُس نے شہر فرعا میں نہیں بلکہ جزیرہ صقلیہ میں اس دنیائے فانی کو رخصت کیا اور وہیں مدفون ہے۔

یونانی فن طب کو اکثر الزام دیا جاتا ہے کہ اُس میں بنیاد زیادہ تر قیاسات پر قائم کی گئی ہے اور کلیات درکنار تشخیص و علاج تک میں قیاسی و عقلی اسباب و علل سے کام لیا جاتا ہے مگر اُس کے سب سے بڑے مجدد جالینوس کا دستور العمل اس کے خلاف تھا۔ اُس کا معمول

تھا کہ تقلید محض سے بھاگتا اور بغیر تجربہ کے کوئی رائے نہیں قائم کرتا ہے
اس طرز عمل کو اُس نے خود ہی بنایا ہے۔ مگر اس سے زیادہ کمال یہ تھا
کہ تجربات کی کثرت نے اُس کے دماغ میں فن طب کے متعلق ایسی
مکمل اجتہادی قوت پیدا کر دی تھی کہ کسی معاملے میں اگر قیاس سے
کام لیتا بھی تو وہ بھی ویسا ہی صحیح ثابت ہوتا جیسا کہ تجربہ کو ثابت ہونا
چاہیے تھا۔

ایک شخص گر پڑا تھا خارجی ادویہ کے استعمال سے چوٹ تو اچھی
ہو گئی مگر ساتھ ہی یہ عجیب و غریب نتیجہ ہوا کہ آواز بند ہو گئی ہزار کوشش
کرتا مُنہ سے آواز نہ نکلتی۔ اطبّا اُس کے علاج سے عاجز آ گئے اور
اُن کی سمجھ میں بھی نہ آتا تھا کہ گرنے اور آواز بند ہونے سے کیا علاقہ
ہے۔ اُس سے جالینوس سے ملاقات ہوئی اور جالینوس نے حالات
سُنتے ہی اُس کو اُن اعضا کی تشریح بتائی جو آواز نکلنے کے آلات
واقع ہوئے ہیں اور اُس کے ذہن نشین کر دیا کہ آواز کن حرکات
سے اور کیونکر نکلتی ہے اور اِسی سلسلے میں اُسے جالینوس نے یہ بھی
بتا دیا کہ گرنے سے آواز کے بند ہونے کا نتیجہ کیونکر پیدا ہوا۔ یہ گفتگو
سُن کے اُس نے اُسی کا علاج شروع کیا اور چند ہی روز میں نظر
آ گیا کہ جو رائے جالینوس نے قائم کی تھی بالکل صحیح تھی۔

بالکل ایسا ہی حال ایک اور شخص کا ہوا۔وہ گھوڑے سے گر پڑا تھا اور بہت چوٹ آئی تھی۔علاج کرنے سے چوٹ کا نام ونشان بھی نہیں باقی رہا مگر اُس کے سلسلے میں یہ نیا مرض اُٹھ کھڑا ہوا کہ دو اُنگلیوں میں حس زائل ہو گئی۔بڑے بڑے اطبا نے سر مارا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ جسم کے مختلف مقامات کی چوٹ سے اُن دو اُنگلیوں کی حس کیوں سلب ہو گئی۔سب طرف سے تھک کے اُس نے جالینوس کی طرف رجوع کیا۔جالینوس نے اُس سے پوچھا تمھارے چوٹ کہاں آئی تھی کہا پیٹھ میں۔دونوں شانوں کے درمیان۔جالینوس کہتا ہے کہ اتنا جواب سُنتے ہی میں نے اصل مرض کا پتہ لگا لیا۔میرے خیال میں آ گیا کہ اُنگلیوں میں جو پٹھے ہیں اُن کی جڑ کو اور خاص اُس مقام پر جہاں سے وہ اُگے ہیں نقصان پہنچا ہے۔وہی دوا جسے اور سب اطبا اُنگلیوں میں لگا رہے تھے میں نے پیٹھ پر اور خاص اُس جگہ جہاں اُس نے چوٹ بتائی تھی استعمال کرائی اور خدا کی قدرت کہ اُنگلیاں اچھی ہو گئیں۔اُن کی حس عود کر آئی اور تمام دیکھنے والے متحیّر ہو گئے۔ ایسے ہی اُس کے اور بھی بہت سے علاج ہمیں معلوم ہوئے ہیں جن سے اُس کی تجربہ کاری اور مہارت فن کے ساتھ اُس کی جودت وذکاوت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اپنی زندگی میں اُسے ایک بہت بڑا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا جس سے زیادہ اہم اور دل بٹھا دینے والا صدمہ صاحبانِ علم کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اُس نے جتنی کتابیں تصنیف کی تھیں وہ باستثنائے چند سب رومتہ الکبریٰ کے کتب خانے میں حفاظت سے رکھی گئی تھیں اس لئے کہ اُن کو اُس نے زیادہ تر اُمراء و سلاطین کی فرمائشوں ہی پر تصنیف کیا تھا بدقسمتی سے وہ روم ہی میں تھا کہ اُس عظیم الشان کتبخانے میں آگ لگ گئی اور تمام دیگر علمی کارناموں کے ساتھ اُس کے کل تصانیف بھی جل کے خاک اور دُنیا سے نابید ہو گئے۔ افسوس کہ اُس نے اپنی بعض باقی ماندہ کتابوں میں جن تصانیف کی فہرست بتائی ہے وہ دنیا میں نہیں ہیں اور اُس کے سامنے ہی فنا ہو چکے تھے۔

جالینوس کے بعد غالباً روم وغیرہ میں بہت سے طبیب ہوئے ہوں مگر ظہورِ اسلام کے زمانہ تک پھر کسی کو وہ عروج و ناموری نہیں حاصل ہوئی جو اُس کو حاصل ہوئی تھی اور اِسی لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ خاتم الاطباء تھا اور اُس کا سا کوئی باکمال اُس کے بعد یونان اور روم کی خاک سے نہیں پیدا ہوا یہاں تک کہ حضرت سرورِ کائنات علیہ السلام پیدا ہوئے اور اطبائے اسلام کا دور دورہ شروع ہوا۔ گو اُن کے ابتدائی دور میں بھی زیادہ تر اطباء

مذہب مسیحی کے پیرو تھے مگر اُن کا شمار اطبائے اسلام ہی میں کیا جانا چاہیے کیونکہ اُن کو اور اُن کے کمالات کو مغرب کی مسیحی دنیا سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اب جالینوس دنیا میں نہیں ہے اُس کے کمالات ہمیشہ زندہ رہیں گے جن کے ساتھ ہی ہمیں اُن کا حلیہ بھی معلوم ہو سکتا ہے اس مشہور و معروف نام والے کی تصویر ہمیں نقاش و مصوّر کے قلم نے تو نہیں دکھائی مگر موّرخین کے قلم نے اُس کی صورت کا ایک مہذّب خاکہ ہمارے پیش نظر کر دیا ہے کہ اُس کی رنگت گندم گوں ہے خط و خال اچھے اور نازک ہیں۔ شانے چوڑے چوڑے ہیں ہتھیلیاں لمبی چوڑی اور وسیع ہیں اور اُنگلیاں لمبی لمبی ہیں۔ بال اچھے اور خوشنما ہیں۔ چہرہ ہنس مکھ ہے چلتا ہے تو بہت متوسط چال چلتا ہے۔ نہ بہت آہستہ اور نہ بہت تیز۔ جس کی وجہ سے وہ ایک عالمانہ وقار کی زندہ تصویر بنا رہتا ہے۔ مگر جو میانہ روی چال ڈھال میں ہے گفتگو میں نہیں ہے اس لئے کہ باتیں زیادہ کرتا ہے۔ کبھی شاذ و نادر ہی خاموش نظر آتا ہے اور گویا اعتراض و نکتہ چینی کرنے پر تُلا رہتا ہے۔ لباس میں عموماً صفائی و پاکیزگی کا اہتمام کرتا ہے اور اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ صرف اتنا ہی

نہیں بلکہ عطر اور خوشبو کا بھی بہت زیادہ شوقین ہے اور جدھر سے گذر جاتا ہے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں اور راستہ مہک اُٹھتا ہے۔ دو چیزوں کا اُسے بے انتہا شوق ہے۔ اور ان دونوں کاموں سے بہت کم خالی نظر آتا ہے۔ یا تو مطالعہ کتب میں مشغول ہوتا ہے یا گانا سنتا ہے۔ موسیقی سے اُکتاتا ہے تو مطالعہ کتب میں اُس کی تفریح ہوتی ہے اور مطالعۂ کتب سے دل اُچاٹ ہوتا ہے تو اچھے گلے کی تانیں اُس کا دل بہلاتی ہیں۔ اِسکے علاوہ دو شوق اور بھی ہیں۔ ایک تو اچھی سواری کا اور دوسرے اچھی نزہت گاہوں کا اور پُر فضا باغوں اور وادیوں کی سیر کا۔ بادشاہوں اور امیروں کے پاس اکثر جاتا ہے۔ جاتا کیا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اُس کا کمال اور اُس کی حذاقت کھینچ لے جاتی ہے جہاں اُس کی قدر منزلت ہوتی ہے۔ خود اُمرا و سلاطین اُس کے سامنے جھکتے ہیں اور دشوار علاجوں میں اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دیتے ہیں۔ مگر باوجود اِس کے اُسے اِس سے نفرت ہے کہ کسی کا پابند بن کے رہے۔ ہال کسی امیر کے ہاتھ میں بیاہے وہ کیسا ہی فیاض و قدر دان ہو، رہن ہو جائے حتیٰ کہ کوئی بادشاہ زبردستیاں کرکے اور جبراً و قہراً اُسے اپنا پابند بنانا چاہتا تو وہ شہر چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوتا اور اُس کی قلمرو سے نکل جاتا ہے۔ الغرض ایسا تھا وہ جالینوس جس کا نام ہماری

صحبتوں میں اِس قدر مشہور ہے اور جس کے کمالات نے دنیا کو
اس قدر اپنا زیرِ احسان بنا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ اُس زمانے میں تھا جبکہ
حضرت مسیح اپنے برحق دین کو تبلیغ فرما چکے تھے مگر اُس نے دینِ مسیح
کو نہیں قبول کیا اور اُن ہدایتوں سے محروم رہا جن کا سرچشمہ ارض
فلسطین تھی۔ تاہم ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا اُس کی مغفرت کرے اور
کیا عجب کہ اُس کی بنی نوع کی خدمت گذاری اور اُس کی رحمدلی
اور خدا ترسی کے اوصاف نے شفاعت کر کے اُس کو نجات
دلا دی ہو۔

ابن بطوطہ

یہ عجیب و غریب مسافر ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم المعروف بہ ابن بطوطہ ہے لیکن ممالک مشرقی کے لوگ اسے شمس الدین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ شخص ملک مراغہ کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا تھا۔ مراغہ جسے اب انگریزی میں مراکو کہتے ہیں، افریقہ کے انتہائی حدود پر واقع ہے۔ وہ مشہور آبنائے جسے آبنائے جبرالٹر کہتے ہیں جو شرقاً و غرباً بحیرۂ روم کو بحراعظم مغرب یعنی اٹلانٹک اوشن سے ملاتی ہے اور شمالاً و جنوباً یورپ کو افریقہ کے پاس پہنچاتی ہے، اس کے جنوبی ساحل سے مراغہ کی سرزمین شروع ہوتی ہے اور شمالی ساحل پر اسپین یعنی قدیم اندلوسیہ کی زمین ہے۔ دونوں ساحلوں پر ایک دوسرے کے مقابل دو شہر آباد ہیں۔ یورپین یعنی شمالی ساحل پر شہر جبرالٹر واقع ہے۔ جو اب تو جبرالٹر ہے مگر کسی زمانے میں جبل الطارق تھا۔ اور شمالی ساحل یعنی مراغہ کی سرزمین پر ایک آباد وسیع اور قدیم شہر ہے۔ جس کو انگریزی میں ٹنجیر اور عربی میں طنجہ کہتے ہیں۔ یہی شہر طنجہ جو پرانی دنیا کی آخری حد پر واقع ہے ابن بطوطہ کا مولد ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں نے صرف بہ نیت حج بیت الحرام اور زیارت

قبر رسول علیہ السلام جمعرات کے روز ۲ رجب ۷۲۵ھ کو اپنے پیارے وطن طنجہ کو چھوڑا۔ اعزا و اقربا میں سے ہر زن و مرد کی مفارقت اپنے اوپر گوارا کر لی اور اس طرح وطن سے نکلا جس طرح چڑیا اپنے آشیانے سے اُڑ جاتی ہے۔ میرا سن اُس وقت بائیس برس کا تھا۔ اور ماں باپ بقید حیات تھے۔ جنھوں نے نہایت دلسوزی سے آنسو بہا بہا کے اور کلیجے پر صبر کی سلیں رکھ رکھ کے مجھے رخصت کیا۔ میں نے اُن کی مفارقت کا داغ سینے میں لیا اور وطن کو خیرباد کہا۔

ابن بطوطہ کا سفر معمولی آدمیوں کا سفر تھا۔ یہ اولوالعزم مسافر جو جو ملک راستے میں پڑے اُن کو بخوبی دیکھتا بھالتا ہر شہر کی معزز سوسائیٹیوں کو پرکھتا۔ اور گاؤں گاؤں پھرتا یا یوں کہنا چاہیے کہ ہر روز نیا دانہ کھاتا اور نیا پانی پیتا روانہ ہوا۔ الجیریا۔ ٹونس طرابلس اور برقا کے مرغزاروں کی ہوا کھاتا ہوا مصر میں پہنچا۔ مصر میں عرصہ تک شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کے سرزمین شام میں پہنچا۔ شام میں بیت المقدس اور تمام مقامات کا سفر کرتا ہوا ایشیائے کوچک میں داخل ہوا۔ اس ملک کے جنوبی اضلاع کی سیر سے خوب سیر ہو کے کوہ لبنان اور بعلبک ہوتا ہوا شہر دمشق میں آیا۔ دمشق کا حال اس نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے جو اس مضمون کے ذریعہ

سے ہمارے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائیگا۔ سردست ہم اجمالی طور پر ابن بطوطہ کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔ دمشق سے نکل کے ابن بطوطہ ارض عرب سے برکتیں حاصل کرتا ہوا مدینہ طیبہ حضرت رسول علیہ السلام میں آیا۔ وہاں سے مکّہ میں جا کے شرکت حج ہوا۔ ابن بطوطہ کے دل میں بچپن سے سفر کا شوق تھا۔ پہلے تو صرف حج اور زیارت روضۂ رسول علیہ السلام کی نیت تھی۔ مگر اب خیالات ایسے وسیع ہوئے کہ ساری دنیا کے سفر پر آمادہ ہو گیا۔ اور مکّہ معظمہ سے خشکی کے راستے عراق عرب میں آیا۔ وہاں کے تمام شہروں میں ہوتا ہوا ایران میں پہنچا۔ ایران میں خوب پھر پھرا کے اور تمام مشہور شہروں کی سیر کر کے پھر عرب میں واپس آیا اور عدن سے جہاز پر سوار ہو کے جنوبی سواحل افریقہ کے شہروں کی طرف روانہ ہوا۔ زنجبار ہوتا ہوا مڈگاسکر کے قریب تک پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد سواحل عرب یمن اور عمان پر ٹھہرتا ہوا گذرا اور خلیج فارس کی طرف سے چڑھ کے ملک ایشیائے کوچک کی سیر میں پھر مشغول ہوا اور عرضاً پورا ملک قطع کر کے بحر اسود کے سواحل پر گیا۔ پھر بلغاریہ میں جا کے قسطنطنیہ میں گیا۔ قسطنطنیہ اُس وقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آیا تھا۔ ایک مہینے سے زائد وہاں ٹھہر کے براہ خشکی سیدھا مشرق کی طرف چلا۔

ماوراالنہراور ایران ہوتا ہوا اور ہر ہر مقام کی سیر کرتا ہوا کابل و قندھار آپہنچا۔ اسکے بعد اُس نے ہندوستان کا سفر شروع کیا۔ پنجاب سے لیکر بنگالہ تک اور شمال اور وسط ہند کے بہت سے مقامات کے علاوہ سندھ سے راس کماری تک اُس نے ہر ہر شہر کی زیارت کی۔ تمام شہروں میں پھر پھرا کے سواحل کرناٹک سے گذرتا ہوا برہما میں داخل ہوا۔ برہما کی سیر سے خوب سیر ہو کر جاوا اور جزائر چین میں پھرتا رہا۔ پھر خاص چین میں گیا اور وہاں سے واپسی کا قصد کر کے عرب ہوتا ہوا اور وسط افریقہ سے گذرتا ہوا مراغہ میں پہنچا۔ وطن میں پہنچ کے ابن بطوطہ نے اپنا سفرنامہ مرتّب کیا اور ایک ایسی عمدہ کتاب اسلامی کتب خانوں کی زیب و زینت کے لئے مرتّب کر دی کہ اُس وقت تک دنیا اُس کی نظیر سے خالی تھی۔ نہیں اسلام ہی کی لٹریری نہیں۔ دنیا کی کل لٹریریاں اس قسم کی کتاب سے اُس وقت تک خالی تھیں۔ اگرچہ اب کچھ تو بوجہ ذرائع سفر میں انتہا سے زیادہ سہولت پیدا ہو جانے کے اور کچھ بباعث عام ذوق سفر بڑھ جانے کے یورپین لوگوں کے سفر زیادہ وسیع معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ابن بطوطہ کے سفرنامے کی وقعت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ اوّل تو قدیمی طور سے قطع منازل کرنے اور ہر ہر گاؤں میں اپنے اختیار کے

موافق قیام کرنے سے۔ جو کچھ تجربہ اور جو لطف سفر ایک قدیم مسافر کو حاصل ہو سکتا تھا وہ اب ان دنوں کے کسی مسافر کو ریلوے ٹرین اور ڈاک کے جہازوں پر سفر کرنے کی صورت میں ممکن نہیں۔ اور قطع نظر اُسی کے سفر نامہ ابن بطوطہ کو اس لئے اور زیادہ تر ترجیح ہے کہ وہ آج سے پانسو برس پہلے کے حالات دنیا کا نمونہ دکھاتا ہے جس پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور جس عہد کی تاریخ کا ایک ایک جملہ (اگر نیا ہو) تو سونے کے مول خریدا جاتا ہے۔ اور موجودہ تمام سفر نامے عام اس سے کہ وہ کسی بادشاہ کے لکھے ہوں یا وزیر کے یا کسی معمولی شائق سفر کے۔ اُن سب کے ذریعہ سے جو کچھ حالات معلوم ہو سکتے ہیں وہ چودھویں صدی ہجری پر محدود ہیں۔ مگر واقعی ہماری قوم سے جہاں اولوالعزمی جاتی رہی وہاں اولوالعزمی کے کاموں کی قدر بھی جاتی رہی۔ اس کا ثبوت اِس سے زیادہ کیا ہوگا کہ سفر نامہ ابن بطوطہ کی ایسی کتاب پہلے فرانس والوں نے بہم پہنچائی اور ۱۸۵۵ء میں پہلے پہل مع فرنچ ترجمہ کے پیرس دارالسلطنت فرانس میں طبع ہوئی جس کی نقل اب تقریباً بیس برس ہوئے مصر میں چھپی ہے مسلمان اپنے خیال میں سعدی شیرازی کے سفر کو اپنے قومی مسافروں کی اولوالعزمی کی انتہا سمجھتے ہیں۔ کبھی ان کے خیال

میں بھی نہ آیا ہوگا کہ ابن بطوطہ کے ایسے مسافر اُن کی قوم میں
گذر چکے ہیں۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں یہ سب سے بڑا
کمال کیا ہے کہ اپنے الہامی انکشاف سے اُس نسل کے مذاق کو سمجھ
گیا جو چار پانسو برس کے بعد آنے والی تھی۔ دیگر عربی مورّخین
کی طرح اُس نے صرف بادشاہ اور وزیر کی داستانیں نہیں لکھی ہیں
بلکہ جس مقام پر پہنچا ہے وہاں کی اخلاقی حالت ملکی عادات مذہبی
رسوم پر خوب غائر نظر ڈالی ہے۔ اور اسی قسم کے حالات سے اپنے
سفرنامے کو مرتب کیا ہے۔

مثلاً جب غرّہ محرم ۷۳۴ھ کو پنجاب میں پہنچا اور اُن تمام
اضلاع میں جن کو دریائے اٹک سیراب کرتا ہے سیر کرتا ہوا سواحل
سندھ کی ہوا کھانے لگا ہے تو اُس نے وہاں کے خاندان کو خوب
غور سے دیکھا۔ اپنے سفرنامے میں اُس نے اُس عربی نسل کا حال
لکھا ہے جو بنوامیّہ کے عہد میں آ کے سندھ کے بلاد میں آباد ہوئی
تھی۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ قدیم عربی اور اسلامی رسوم سے وہ لوگ
کسقدر ہٹ گئے ہیں۔ اور اب زمین ہند کی آب و ہوا نے اُن پر
کیا اثر کیا ہے۔ پھر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا ہے اور انتظام ملکی اور
ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی اخلاقی حالت سے تجربے کے

مختلف سبق لیتا گیا ہے۔ یہاں ہندو عورتوں کے ستی ہونے کی
رسم نے اُسے نہایت ہی حیرت و عبرت میں ڈال دیا ہے۔ کئی مرتبہ
اُس آدمی نے خود جا کے عورتوں کے ستی ہونے کا تماشہ اپنی آنکھ
سے دیکھا۔ ابن بطوطہ جس وقت ہندوستان میں آیا ہے اُس وقت
سلطان شاہ محمد ابن سلطان غیاث الدین تغلق ہندوستان کا فرمانروا
تھا جس کے دربار تک ابن بطوطہ کی رسائی ہوئی تھی اور نہایت
قدر و منزلت کی گئی تھی۔

ابن بطوطہ کے بیان سے ایک امر ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی
طرف ہمارے عام احباب تو درکنار اُن لوگوں کا خیال بھی کبھی نہ گیا
ہوگا جن کو تاریخ میں بصیرت ہے۔ وہ یہ کہ دنیائے اسلام جو مشرق
سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر اس کے اجزا آج ایسے پریشان نظر
آتے ہیں کہ ایک دوسرے کے حالات سے کبھی مطلع نہیں ہوتا۔ اِس
عہد میں یہ دنیا یوں بے تعلق نہ تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج جبکہ
دودی جہازوں اور ریلوے ٹرینوں نے عالم کے ہر ہر کونے کو
ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ ایک ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے
ملک کے مسلمانوں کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں کون جانتا
ہے کہ مراغہ میں کیا ہوتا ہے۔ طرابلس والے کیا کر رہے ہیں۔ ٹونس پر

کیا مصیبت پڑی ہے۔ الجیرس (جسے عربی میں الجزائر کہتے ہیں۔)
کے مسلمان کس خیال میں ہیں۔ زنجبار والے کیسے ہوتے ہیں اور
برہما اور چین کے اہل اسلام کے کیا خیالات ہیں۔ اور جس طرح
ہم لاعلمی کی کوٹھری میں بند ہیں اُسی طرح ان مذکورہ مقامات کے
لوگ بھی ہمارے حالات سے بے خبر ہوں گے۔ مگر کتنی بڑی حیرت
کی بات ہے کہ پانسو برس پیشتر کا زمانہ جب نہ یہ دودی جہاز تھے
اور نہ یہ ریل تھی اور نہ یہ تار برقی کا سلسلہ قائم تھا۔ ایسا مذہب
تھا کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملکوں کی سیر ین کرتے تھے
اور رشتۂ اخوت اسلامی کو روز بروز زیادہ مضبوط کرتے تھے۔ ابن
بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص ہندوستان میں غرناطہ
اور قرطبہ کے بعض بعض لوگ موجود تھے۔ اور سفر اُن کی نظر میں
ایک ایسی چیز تھا کہ بے خوف و خطر ہر چہار طرف پھیل جاتے تھے۔
مثلاً لکھتا ہے کہ جب میں اسکندریہ میں امام برہان الدین اعرج سے
ملا جو وہاں کے مشہور اور اہل دل ائمہ میں سے تھے۔ اگرچہ اُس وقت
تک میرے دل میں سوا حج اور زیارت تربت رسول کے اور کسی سفر
کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے میری سیاحت پسند
طبیعت کا اندازہ کرکے یا اپنے مکاشفہ کے علم سے مطلع ہو کر کہا۔

غالباً دور دور کے ملکوں تک تمہاری رسائی ہوگی اور دنیا کے ہر ہر کونے کی تم سیر کروگے۔ اگر ایسا ہو تو میرے بھائی فرید الدین کو ہند میں اور میرے بھائی رکن الدین کو سندھ میں اور میرے ہمنام بھائی برہان الدین کو چین میں میرا اسلام پہنچا دینا۔ ابن بطوطہ ان تینوں بھائیوں سے ملا ہے۔ بلکہ فرید الدین کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ شہنشاہ دہلی کے اُستاد تھے اور صلہ اُستادی میں اُن کو پنجاب کا قدیم مشہور شہر اجودھن جاگیر میں دیا گیا تھا اور وہیں اجودھن میں جاکے اُن کی ملاقات سے محظوظ ہوا۔ اور لکھتا ہے کہ دمشق کی مشہور اور عالیشان مسجد جو جامع بنی امیّہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہے۔ اُس میں مالکیوں کے امام فقیہ ابو عمر بن ابی الولید بن الحاج التجیبی تھے۔ جن کا خاندان تو غرناطہ کا تھا مگر پیدا وہ قرطبہ میں ہوئے تھے اور آخر میں دمشق کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے دمشق میں جن جن علماء سے سند حاصل کی اُن میں سے سب سے زیادہ مستند اور متبحر شہاب الدین احمد معروف با بن شحنہ حجازی تھے۔ ماہ مبارک رمضان ۷۲۶ھ میں کتاب صحیح بخاری چودہ جلسوں میں مَیں نے ابن شحنہ ممدوح کی زبان سے سُن کے سند حاصل کی۔ اور ابن شحنہ کو مشہور مورخ شام امام حافظ علم الدین ابو محمد قاسم بن محمد یوسف کے تلمذ کا فخر تھا۔ اور حافظ

علم الدین ممدوح اسپین کے شہر اشبیلیہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے آخر سرزمین شام میں توطن اختیار کیا۔ اور بے مثل تاریخ شام مرتب کی۔ اس کے علاوہ نوبتِ رسول کے خدام میں اُس نے ایسے کئی لوگوں کے نام بتائے ہیں جو غرناطہ کے رہنے والے تھے۔ اور جن کو سرزمین یورپ نے خدا کے حبیب خاص پیغمبر عرب صلوٰۃ اللہ سلامہ علیہ کے روضۂ مطہر کی خدمت کے لئے پیش کیا تھا۔

ابن بطوطہ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ جس سے اُن دنوں کے دینی جوش اور نیز بادشاہوں کی قدردانی کا اندازہ ہونے کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایک غرناطہ کا رہنے والا کیونکر ہندوستان میں آیا اور شاہی دربار میں پہنچا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میرے ہمراہی غرناطہ کا ایک خوش اوقات اور پاک نفس فقیر علی بن حجر زیارت مدینۃ الرسول سے مشرف یاب ہوا تھا۔ اتفاقاً پہلی شب کو اُس نے خواب میں منادیِ غیب کی زبان سے یہ دو شعر سُنے ؎

هنيئاً لكم يا زائرين ضريحه

امنتم به يوم المعاد من الرجس

یعنی اے اُس رسول پاک کے روضۂ مقدس کی زیارت کرنے والو تمھیں مبارک ہو کہ بہ برکت اس رسول کے روزِ جزا کو تم

تمام خرابیوں سے امن اور نجات پاؤ گے ؎

وصلتم الی قبر الحبیب بطیبۂ

فطوبیٰ لمن یضحی بطیبۂ او یمسی

تم ارض طیبّہ روضۂ حبیب خدا کی زیارت سے مشرفیاب ہوئے۔ مرحبا اُس شخص کو جس کی صبح و شام ارض طیبّہ میں ہو۔

یہ اشعار اُس نے صبح کو مجھ سے بیان کئے پھر میں تو دنیا کے اور اطراف میں چلا گیا اور علی بن حجر جو در رسول ہی میں مقیم رہا یہانتک کہ ۷۴۳ھ میں جب میں سرزمین ہند میں پہنچا تو اُس نے بھی اتفاقاً ہندوستان کا سفر کیا۔ اور دہلی میں پہنچ کے میرے پڑوس ہی میں اُترا۔ مجھے جب شہنشاہ ہند کے دربار میں جانے کی عزّت حاصل ہوئی تو میں نے بادشاہ سے اُس کا حال بیان کیا اور اُن اشعار کو پڑھا۔ بادشاہ نے علی بن حجر سے ملنے کا شوق ظاہر کیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ اُس کو دربار میں لا کے حاضر کرو۔ جب علی بن حجر سلطان محمد تغلق کے سامنے آیا تو بادشاہ نے اُس سے فرمایش کی کہ مدینۂ طیبّہ میں جو خواب دیکھا تھا اُس کو اپنی زبان سے بیان کرے۔ اُس کی زبانی یہ اشعار سُن کے سلطان بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ انعام کے طور پر تین سو اشرفیاں اور ایک خاصہ کا گھوڑا مع تمام سامانوں کے اُس کو

دیا جائے۔ علی ابن حجر اُس وقت سے ایک عمدہ مکان میں رہنے لگا۔
اِن دنوں دہلی میں غرناطہ کا ایک متبحّر فقیہ تھا جو جمال الدین مغربی
کے لقب سے مشہور تھا۔ اُس کو علی بن حجر نے اپنے مکان کے ایک
حصّہ میں اُتارا اور وعدہ کیا کہ اپنی بیٹی اُس کے عقد میں دیدیگا۔
ایک غلام اور ایک لونڈی مول لی جو ہر وقت اُس کی خدمت
میں رہا کرتے تھے اور باقی ماندہ اشرفیوں کو ہر لحظہ اپنے سامنے
رکھتا تھا کہ کوئی چُرا نہ لے۔ اتفاقاً غلام اور لونڈی کا ہاتھ اشرفیوں
تک پہنچ گیا اور لے کے چلدئے۔ اس نقصان نے علی بن حجر کو
ایسا صدمہ دیا کہ کھانا پینا چھوٹ گیا اور بیمار پڑ گیا۔ سلطان کو اُسکی
خبر ہوئی تو حکم دیا کہ تین سو اشرفیاں پھر دیدی جائیں۔ مگر جب تک
یہ خبر پہنچے پہنچے موت علی بن حجر کا کام تمام کر چکی تھی۔ علی بن حجر
کے بعد جمال الدین مغربی متوطن غرناطہ دہلی ہی میں رہا۔ بلکہ
ایک مقام پر ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ
ہندوستان میں آیا تھا۔ پھر یہیں اُس نے شادی کر لی۔ اور
صاحبِ اہل و عیال ہو گیا۔ ابن بطوطہ نے ہندوستان اور خصوصاً
شہر دہلی اور شاہی دربار کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔
جن لوگوں نے آجکل تاریخیں لکھی ہیں اُنھوں نے سلطان محمد تغلق

کے حالات پر ایسے ریمارک کئے ہیں کہ اُن کی تحریر سے اُس
بادشاہ میں ہر طرح کے عیوب اور برائیاں ثابت ہوئی ہیں۔
حالانکہ ابن بطوطہ جس نے اُس کے دربار کو اپنی آنکھوں سے
دیکھا ہے نہایت آزادی سے دعویٰ کرتا ہے کہ اس بادشاہ میں
اگرچہ بعض بہت بڑے نقائص تھے۔ مگر اس میں بہت سی خوبیاں بھی
تھیں جو اُس کے پہلے اور بعد دنیا کے کسی شہنشاہ میں نہ ہوئی
ہوں گی۔

شیخ سعدی شیرازی

شیخ کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلّص ہے۔
سرگور اوسلی نے اُس کی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء
میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے
اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔
شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ
بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی
کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی
سعد کے یہاں کسی خدمت پر مامور تھا اس لئے اُس نے اپنا تخلّص
سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے
ایک باخدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ
نہیں معلوم کہ نماز و روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں
یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت شب بیداری
اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عیدا اور تہواروں میں
ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔
باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کے نسبت

بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اِسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہوگا۔ کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی کئی تذکروں میں ہے لکھا ہے کہ علاّمہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگردِ رشید اور ہلاکو خاں کا مصاحب خاص تھا۔ شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا۔ مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علاّمہ کے باہم ایسی بے تکلّفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال شیخ اور علاّمہ دونوں ہمعصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زُہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے

قرب و جوار میں علما، اور مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جمِ غفیر کا شہرہ جو خطّہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے، بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اِسی لئے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیّا تھا، علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے، مدرسہ عضدّیہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُسوقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہلِ شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل، رحمدل، با مروّت اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا اور اپنی مہمّات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اوّل اتابک اوزبک

پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبت شیراز بکلی بگرفت
وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حب وطن گرچہ حدیث است صحیح
نتواں مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ۔ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مرا نہیں جاتا۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلاد اسلام میں جا بجا کھلے ہوئے تھے جہاں دور دور سے طالب علم آکر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات۔ نیشاپور۔ اصفہان۔ بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک

طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور مشہور تھے۔ اِن کے سوا شام، عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی۔ جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ ہجری میں بنوایا تھا۔ ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسہ سے تعلیم پاکر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اِس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہہ نہ رہتا تھا۔ امام ابوحامد غزالی شیخ عراق عبدالقاہر سُہروردی اُستاد الائمہ ابوحامد عماد الدین موصلی اور اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اِسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اُس کا ہموطن شیخ ابواسحاق شیرازی جس کا علم وفضل شہرۂ آفاق تھا مدت تک اس مدرسہ کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اوّل یہاں کا متولی شیخ ابواسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسہ سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جاکر تحصیل علم شروع کی اور

جیسا کہ بوستاں میں اس نے تصریح کی ہے۔ وہاں سے اُس کے لئے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا اُن میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی ہے۔ جس کا لقب جمال الدین ہے۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بیشمار کتابیں اُس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے اُن کا تراشہ میرے حجرے میں ہے۔ مرنے کے بعد مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لئے اس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اُس کی وصیت کے موافق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی اور سرگور اوسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوف اور طریق معرفت اور سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ اُنھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی وفات ۵۶۱ھ ہجری میں

یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُس کے ساتھ رہا ہے۔ شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حُسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے۔ اُستاد یہ سُن کر شیخ پر غصے ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک وحسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ وہ رشک وحسد سے اور تم بدگوئی اور غیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علمار

کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بدآواز قوّال سے پالا پڑا اور بضرورت ساری رات اُس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوّال کی نذر کیں۔ اصحابِ مجلس کو اس حرکت پر تعجب ہوا۔

شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اِس بزرگوار قوّال کے تصرّف سے میں نے ہمیشہ کے لئے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم طالب علمی ہی میں تصوّف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اُتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقہ کو چھوڑ کر اِس کوچہ میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ

اپنے ساتھ دوستوں کو بھی بچا ئیں۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اس کو کسی سرزمین کے ساتھ اعراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا، اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب صنعت و حرفت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے۔ عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے شہریار اور فرمانروا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی۔ وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے

کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر اُسی آنکھ سے اُس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اُس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اُس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اُس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشہ شیخ کے لئے ایک نہایت عمدہ سبق تھا۔ جس نے اُس کے دل میں قوم کی دلسوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اُس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیراندیشی میں صرف کی۔ القصہ شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر

سیر و سیاحت کرتا رہا۔ جب کتاب کے مطالعہ سے اُس کا جی سیر ہو گیا
تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ
اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ہے اور تیس برس سیر و
سفر میں۔ اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی
میں بسر کئے ہیں۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی
حصّے مقرر کرنے تکلّف سے خالی نہیں اور غالباً یہ مضمون منوشاستر
سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس میں عمر ایسے ایسے تین یا چار حصّوں پر تقسیم
کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصّہ
تحصیل علم اور سفر میں بسر ہوا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ
عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا۔
اگرچہ اُس کی شہرت طبقۂ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ
شعراء میں ہوئی۔ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق
اور سلجھا ہوا عالم تھا۔ بعض موقعوں پر فقہا اور قضّاۃ کے مجمعوں میں
اُس کو بحث و مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اُس کی رائے
سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر
میں جہاں اُس کے جان پہچان کے کم تھے۔ کسی تقریب سے قاضی شہر
کی مجلس میں اُس کا گذر ہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور

مجلس میں تمام علماء و فقہاء کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا اور مشکل سے پائین مجلس جگہ ملی۔ اُس وقت کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دور ہی سے بآواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی۔ قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیئے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر و ذلیل معلوم ہوں گے تو پھٹے پرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگذشت بوستاں میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگذشت ہے۔ مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص اپنی روداد لکھی ہے۔ شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے۔ مگر ظاہرا یہ

معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر اُس کی ہمّت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی۔ اس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلادِ شام میں اُس نے مدّتوں وعظ کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا۔ اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے، جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد کہ ایک راہرو وہاں سے گذرا اُس نے میرا بیان سُن کر ایسا پُرجوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اُس کے ساتھ چیخ گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔ شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرّہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی، بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے

سوانحِ خانہ سومنات کے قصہ میں اُس نے ایک جگہ ظاہر
کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا۔ سر گور اوسلی لکھتے ہیں کہ ایشیائی
جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ ۱۸۴۳ء میں فرانس کے مشہور محقق
ام گارسن ڈی تاسی نے لکھا ہے کہ سعدی پہلا شخص ہے جس نے
ہندوستانی زبان یعنی ریختہ میں جبکہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا
تھا شعر کہا ہے۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور بلکہ اُس سے
پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ
دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اُس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ
ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اُس کی وفات
کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے
پہلے اُس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔

اشعار

قشقہ جو دیدم بر رخش گفتم یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ ڈرا اے باوری اس ملک کی یہ ریت ہے

ہمنا تمھن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

سعدی بگفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرہ میں ان اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے۔ مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔ سر گور اوسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے اس بیان میں ظاہرا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ایک مدّت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام عراق۔ فلسطین۔ مصر۔ یمن اور ہندوستان میں مدّت دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ وہ ان ملکوں کی زبانوں سے کافی واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے سوا اُس نے اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے جس میں اکثر کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سر گور اوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ کے

سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سنا۔ اس نے
ایشیائے کوچک۔ بربر۔ حبش۔ مصر۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ عرب
جملہ ممالک ایران۔ اکثر ممالک توران۔ ہندوستان۔ رودبار۔ دیلم۔
کاشغر اور جیحون سے آگے تک اور بصرہ، بغداد ستقین وال تک کی
سیر کی تھی۔ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار مرتبہ
ہندوستان آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ از انجملہ ایک دفعہ پٹھان اغلمش
کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی میں آیا
ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مضمون محض بے سروپا ہے۔ اغلمش کوئی
بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا۔ شاید سلطان التمش کے دھوکے
میں اغلمش لکھا گیا۔ بے شک شیخ نے اغلمش کا ذکر گلستاں میں ایک
جگہ کیا ہے۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ سرہنگ زادہ را بر در سرائے اغلمش
دیدم۔ مگر ہندوستان میں کوئی اغلمش یا سرائے اغلمش نہیں سنی گئی۔
سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اکثر
تذکرہ نویسوں کو یہ شبہہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب
جواہر الاسرار میں لکھا ہے، شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندوستان
میں آیا ہے۔ مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے
عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے

سے لئے آنا خلاف قیاس ہے۔ خسرو کی ولادت ۶۵۱ ہجری میں
ہوئی ہے جبکہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی اب اگر امیر خسرو
کی شہرت بفرضِ محال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی
تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہئے۔ پس یہ
کیونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانۂ
وقت اور مقبول خاص و عام ہو ایک پچیس برس کے لڑکے کی
شہرت سن کر ایران سے ہندوستان میں آئے۔ البتہ معتبر حوالوں
سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے
قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں شیخ
سے دوبارہ درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے اور چونکہ امیر
خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے، اس لئے انکا
کلام بھی شیخ کے ملاحظہ کے لئے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمر ہو گیا
تھا اس سبب سے خود نہ آ سکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دونوں
دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو
کی نسبت یہ لکھا کہ اس جوہر قابل کی تربیت اور قدر افزا
کرنی چاہیئے۔

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے

صرف بوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومنات سے
نکل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے
بحرِ ہند اور بحرِ عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان میں ثابت ہوتے
ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان، ترکستان اور تاتار
تک گیا ہے اور بلخ۔ کاشغر وغیرہ میں رہا ہے۔ جنوب میں سومنات
تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھہرا اور سومنات سے مغربی
ہندوستان پھر کر دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا۔ شمال اور مغرب
کی طرف عراق۔ عجم۔ آذربائیجان۔ عراق۔ عرب۔ شام فلسطین اور
ایشیائے کوچک میں بارہا اُس کا گذر ہوا ہے۔ اصفہان تبریز۔ بصرہ۔
واسط۔ بیت المقدس۔ طرابلس شرق۔ دمشق دیار بکر اور اقصائے روم
کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اُس کی آمد و رفت رہی
ہے۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور
وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان سے مراجعت کے وقت
یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں پہنچنا۔
اسکندریہ۔ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں۔
شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس۔ بحرِ عمان

بحر ہند۔ بحر عرب۔ بحر قلزم اور بحر روم میں اُس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کئے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک سفر کا حال بوستاں میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اس نے اونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو جرس کی آواز بھی سن کر نہیں اٹھتا۔ بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحرائے لق و دق چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے جو حجاج کوفہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستہ کے بیچوں بیچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اس صحرا میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی راہ سے پیادہ پا حج کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اٹھائی ہیں۔

کریم خاں زند نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے۔ اُس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطہ کے دروازہ پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستاں کا ترجمہ انگریزی میں چھاپا ہے اُس میں شیخ کی اُس تصویر کا فوٹوگراف بھی چھاپا ہے۔ شیخ کی شبیہ میں ایک کشکول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تبر اس کے کندھے پر ہے جو کہ اُس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے۔

شیخ کے کلام سے بھی جابجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سروسامان اور متوکّل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے اور بعض موقعوں پر اُس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

ساتویں صدی ہجری میں اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گذرا ہے۔ جس کا ذکر گلستاں کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا

چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اُس وقت طرابلس شرق یعنی مشرقی ٹرپولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لئے خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی امیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلگیریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے ساتھ لائے تھے۔) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگایا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقفکار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ دردانگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے جو شخص بیگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دیکر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی ناکتخدا تھی شیخ کا نکاح سو دینار مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گذری مگر بیوی کی بدمزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آگیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ کیا آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دیکر خریدا ہے۔ شیخ نے کہا ہاں بیشک میں وہی ہوں۔ دس دینار دیکر مجھے خریدا ہے۔ اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس

اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر
اس حکایت میں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں
اور سختیاں اکثر گذری ہیں۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے
کبھی زمانہ کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر
دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے
کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگ دل کوفہ کی جامع مسجد میں
پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔
اُس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے۔
عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا
مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ
میں جبکہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت
سختی گزرنے لگی اس زمانہ میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولتمند تھا۔
غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔
کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رُفقا میں تھے شیخ کے پاس آئے اور اُس
ہیجڑے کے یہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی شیخ نے اُن کے ساتھ
دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے
تو بھی کتے کا چھوڑا نہیں کھاتا۔

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اُس نے گلستاں اور بوستاں میں
بیان کئے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ کا ہے۔ جو
بوستاں کے آٹھویں باب میں مذکور ہے۔ یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب میں
سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا ایک بُت کی پرستش
کے لئے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں
تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔
اس بات کی تحقیق کے لئے میں نے ایک براہمن سے ملاقات پیدا کی۔
ایک روز اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بیحس مورت پر کیوں اس قدر
فریفتہ ہیں؟ اور اُس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔
برہمن نے مندر کے پوجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آ کر گھیر لیا۔
میں نے مصلحتہً اُن کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی
سے نہیں کہی میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نووارد
ہوں اور اسرارِ نہانی سے ناواقف ہوں اس لئے اس کی حقیقت
دریافت کرنی چاہتا ہوں۔ تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اُس نے
یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ تجھ کو اصل حقیقت
معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے
مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔

جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔
یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے جب وہ لوگ چلے گئے تو
برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا۔
میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال
ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اُس
مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور
بظاہر چند روز کے لئے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا
تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے۔ میں نے مندر کا دروازہ تو بند
کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا
شروع کیا وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا۔ جس کے پیچھے ایک پجاری
چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی معلوم ہوا کہ
جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اُس مورت کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے۔
اسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پوجاری نے جب دیکھا
کہ راز فاش ہو گیا۔ وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا میں بھی اُسکے
پیچھے دوڑا۔ اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے اُس کو
پکڑ کر ایک کنویں میں گرا دیا۔ اس کے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا
اور ہندوستان میں ہوتا ہوا یمن کے رستے جہاز میں پہنچا۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں
جہاں ہزاروں پجاری اور سیکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت
اور سیکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ
آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اس کے سوا کوئی متنفس
باقی نہ رہا۔ اس کے سوا ایسے سنّاٹے کے وقت جبکہ مندر میں کوئی متنفس
موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس
غرض سے تھا اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید
اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور
ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنوئیں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا
صحیح ہو۔ مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے
تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی۔ اصل یہ ہے
کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ
کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے
اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رَو میں بہہ کر واقعہ سے دور پڑ جاتا
ہے۔ بس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو
اس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا

موقع ملتا ہے۔

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لئے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا اور ۶۲۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانہ میں وطن نہیں آیا۔ کیونکہ اس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی تھی۔

اتابک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے فارس کو جو دو سو برس سے مورد آفات و حوادث تھا۔ چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کئے ہیں مگر اس میں شک نہیں اس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیکنامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اس کی شہرت سن کر آتے اور ان کی کمال تعظیم و التزام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں۔ عبادت خانے۔ مدرسے اور

مسجدیں جو ویران ہوگئی تھیں اُس کے عہد میں آباد کی گئیں اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے دکانوں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفاخانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اُس پر مامور کیے اپنی دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کی سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا اور ۱۲۲۶ء سے ۱۲۶۰ء تک سلطنت کی مدت تک اُس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رُخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہوگیا تب شام سے عراق عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے۔ شیراز میں پہنچا۔ شیخ کے کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے جس سے ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور اطاعت کرتا تھا۔ سرداروں کو وہ برابر قصائد اور پندنامہ وغیرہ میں اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ

چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اس کے سوا اتابک عادل شمس الدین جو کہ غالباً انکیانو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا، وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزّت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں سبزی فروشوں کے ہاتھ جبراً کسی وعدہ پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دکان پر بھی جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقال کی دکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اُس زمانہ میں حضرت ابو عبداللہ ابن خفیف کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اس واقعہ کی خبر پہنچی۔ اُس نے اتابک شمس الدین کو جو کہ اُس حال سے بیخبر تھا۔ ایک قطعہ لکھ بھیجا۔ جس میں اہل فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دکانداری اور بینوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کرکے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے خرچ کے لئے ہے۔ اُس کو قبول کیجئے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی۔

شیخ کی وفات شیراز میں جبکہ اتابکان فارس کے خاندان کا

خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس خانان تاتار کی حکومت میں آگئی
تھی سنہ ۹۱۶ ہجری میں واقع ہوئی ہے



شاہ فتح اللہ شیرازی

تعجب ہے کہ ایسا جلیل القدر فاضل اس کا حال نہ علمائے ایران نے اپنے تذکروں میں لکھا نہ علمائے ہندوستان نے۔ بہت تذکرے دیکھے۔ لیکن نہ پایا۔ ناچار جس طرح کتابوں کے ورق ورق بلکہ سطر سطر دیکھ کر اور امرائے اکبری کے حالات چنے اسی طرح ان کے حالات بھی پھول پھول بلکہ پتی پتی چن کر ایک گلدستہ سجاتا ہوں۔

سید تھے اور وطن شیراز تھا۔ جب تحصیل سے فارغ ہوئے تو شہرۂ کمال کا نور صبح صادق کی طرح عالم میں پھیلا۔ کمال الدین شیروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے شاگرد تھے۔ ملا ابن احمد رازی نے ہفت اقلیم میں اتنا زیادہ لکھا ہے: "ابتدا میں فنائے دنیا کے خیالات دل پر چھائے تھے۔ ضروریات علمی حاصل کرکے اہل عبادت گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ اور اکثر میر شاہ میر کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے۔ اس عرصہ میں اہل علم اور صاحبان فضل کی تقریب پر راغب ہوئے۔ اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے۔ پہلے ہی دن حاشیہ پڑھنے بیٹھے۔ (پڑھتے جاتے تھے اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے

اُس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف اِن سے ادا ہوئے کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ اُس مُلک میں دستور ہے کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے تو اُٹھ کر اپنے اُستاد کی خدمت میں تعظیم وتکریم بجا لاتا ہے۔ اُنھوں نے چاہا کہ کھڑے ہوکر لوازم تعظیم ادا کریں۔ خواجہ نے سبقت کرکے خود سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تیرا آج تم نے تایں استفیض کیا۔ چنانچہ چند روز میں منتہی ہوکر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے۔ پھر دکن میں آکر والیِ بیجاپور کے دربار میں منصب وکالت پایا۔ وہ مرگیا تو دربار اکبری میں آئے اور عضدالدولہ خطاب ملا۔ وغیرہ وغیرہ۔"]

محمد قاسم فرشتہ فرماتے ہیں کہ علی عادل شاہ بیجاپور نے جب اِن کے اوصاف سُنے تو ہزار آرزوؤں سے لاکھوں روپئے اور خلعت و انعام بھیج کر شیراز سے بلایا۔ بادشاہ مذکور نے امارت کے اعزاز سے رکھا اور خلوت وجلوت میں مصاحبت کے ساتھ رہے ۹۸۸ھ سے ابراہیم عادل شاہ کا دور ہوا۔ اُس نے اُنھیں کی سعی اور تدبیر سے تاج و تخت پایا۔ چنانچہ دربار میں اعزاز و احترام کے ساتھ ارکانِ دولت میں داخل تھے۔ مگر دل سے خوش نہ تھے۔ اور خوش کیا رہتے۔ وہاں کا حال اگر معلوم نہیں تو سہ نثر ظہوری ہی کو دیکھ لو۔ انتہا ہے کہ حمد ہے تو راگ میں۔ نعت ہے تو اِسی سہاگ میں۔ کتاب ہے تو

اس شہر ہے تو نورس پور۔ باغ ہے تو نورس بہشت۔ خدا رسول۔ دین ایمان۔ ذہن کی جودت۔ طبیعت کی ایجاد سب اس میں خرچ ہوتے تھے ۔

لطیفہ۔ جس طرح ستار۔ تنبورا۔ بین وغیرہ ساز ہوتے ہیں، اسی طرح کا ایک ساز ایجاد کیا تھا۔ اس کا نام رکھا تھا۔ موتے خان اس کی بڑی تعظیم تھی۔ درگاہ کی طرح پُجتا تھا۔ ہاتھی پر چڑھ کر عماری میں بیٹھتا تھا۔ ماہی مراتب۔ علم و نقارہ اس کے آگے چلتا تھا عرض کیا دربار کیا محل آٹھ پہر ناچ رنگ گانے بجانے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈوم ڈھاری۔ گاہک نایک۔ سپروائی اس کی صحبت میں مصاحب تھے شاہ فتح اللہ شیرازی کجا اور یہ باتیں کجا۔ ہندوستان میں اکبری اقبال کا نشان آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ علما کے جلسے اور علوم کے چرچے ہوتے تھے۔ ایرانی اہل کمال آتے تھے۔ اور اعلیٰ رتبہ و اعزاز حاصل کرتے تھے۔ خبریں سن سن کر ان کے دل میں بھی شوق لہریں مارتا تھا۔ مگر آنہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایشیائی حکومتوں میں ایسی باتوں کی روک ٹوک بہت ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی جان سے بھی ضائع کر دیتے تھے۔ اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھیں فرمان بھیجا۔ اُدھر خود ابراہیم عادل شاہ کوکلھا۔ راجہ علی خاں حاکم خاندیش سے بھی تحریک ہوئی۔ غرض کہ

سنہ ۹۹۰ھ میں روانہ دربار ہوئے۔ اب دیکھئے ملا صاحب کے غصے حروف و الفاظ کے رنگ میں کیونکر پیچ و تاب کھا کر نکلتے ہیں۔ اور غصہ بجا ہے۔ غیر ملک کا عالم آکر اس طرح بڑھ جائے اور چڑھ جائے اور ہم وہی ملا کے ملا۔ مگر اُن کی واقع نگاری کو ہزار آفریں ہے کہ میر موصوف کے علم و فضل سے انکار نہ کیا۔ البتہ اِس پر خاک خوب ڈالی۔ خیر فرماتے ہیں۔

ربیع الاول سنہ ۹۹۰ھ میں سیادت پناہ میر فتح اللہ شیرازی کہ وادی الٰہیات۔ ریاضیات۔ طبعیات۔ اور کُل اقسامِ علوم عقلی و نقلی اور طلسمات و نیر نجات جرِ اثقال میں اپنا نظیر زمانہ میں نہیں رکھتا۔ فرمان طلب کے بموجب عادل خان دکنی کے پاس سے فتح پور میں پہنچا۔ خان خاناں اور حکیم ابو الفتح حسب الحکم استقبال کے لئے گئے۔ اور لاکر ملازمت کروائی۔ صدارت کے منصب پر کہ سیاہ نویسی سے زیادہ بات نہیں ہے۔ [گویا کچھ بڑی بات نہیں] اعزاز پایا تاکہ غریبوں کی زمین کاٹے نہ کر دے۔ اور پرگنہ بساور بے داغ و محلی جاگیر میں ملا۔ سُن چکے تھے کہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا بے واسطہ شاگرد ہے۔ وہ نماز اور عبادات کے چنداں مقید نہ تھے۔ اِس لئے خیال تھا کہ مذہبی باتوں میں ہمارے ساتھ ہو جائیگا۔ مگر اُس نے اپنے مذہب کے میدان میں استقلال

دکھایا۔ باوجود حُبِّ جاہ اور دنیا داری اور اُمرا پرستی کے تعصب مذہب کے نکتوں سے ایک دقیقہ نہ چھوڑا۔ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز پڑھ سکے، وہ بہ فراغِ بال و جمعیتِ خاطر باجماعت مذہبِ امامیہ کی نماز پڑھتا تھا۔ چنانچہ یہ بات سُن کر زمرۂ اصحابِ تقلید سے گننے لگے۔ اور اِس معاملے سے چشم پوشی کر کے علم وحکمت اور تدبیر اور مصلحت کی رعایت سے پرورش میں ایک دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مظفر خاں کی چھوٹی بیٹی سے اُس کی شادی کر کے اپنا ہم زلف بنایا اور منصب وزارت میں راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک کیا۔ وہ راجہ کے ساتھ خوب دلیری سے کام کرنے لگا۔ مگر دار مدار کے ساتھ کرتا تھا۔

(آزاد۔ ملّا صاحب خفا ہوتے ہیں کہ مظفر خاں اور شاہ منصور کی طرح راجہ سے کیوں لڑتے جھگڑتے نہ رہے۔ اور یہ اُس مدرسہ کے مدرّس تھے۔ جہاں اپنی رائے اور تجویز اتنا ہی اختیار دیتی ہیں کہ سلامت روی اور مصلاحیت کے ورق کو ہوائی حرکت نہ دے۔ پھر فرماتے ہیں۔ اُمرا کی لڑکیوں کی تعلیم کی پابندی اختیار کی تھی۔ اُن کے گھروں پر روز جاتا تھا۔ سب سے پہلے حکیم ابوالفتح کے غلام کو کبھی شیخ ابوالفضل کے بیٹے کو اور امیرزادوں کو سات آٹھ برس کے بلکہ اِن سے بھی

چھوٹے چھوٹوں کو میاں جی بن کر پڑھاتا تھا اور لفظ اور خط اور دائرہ اکسپہ بلکہ اب جد بھی سکھاتا تھا۔ اور کندھے پہ بندوق۔ کیسہ وار وکمر سے باندھ کر قاصدوں کی طرح جنگل میں سواری کے ساتھ دوڑتا تھا۔ غرض جس علم کی شان جا چکی تھی، اُسے خاک میں ملا دیا۔ اور باوجود ان سب باتوں کے اپنے اعتقاد کے استقلال میں وہ پہلوانی۔ کہ کوئی رستم نہ کرے گا۔ اس نے کی تاریخ ہوئی۔ ع

شاہ فتح اللہ امام اولیا

ایک شب اُس کے سامنے بیربل سے کہہ رہے تھے۔ یہ بات عقل کیوں کر مان لے۔ کہ کوئی شخص ایک پلک مارتے باوجود اس گرانی جسم کے بستر سے آسمان پر جائے۔ اور نوّے ہزار باتیں گو مگو خدا سے کرے اور بستر ابھی گرم ہی ہو کہ پھر آئے۔ اور لوگ اس دعوے کو مان لیں۔ اسی طرح شق قمر وغیرہ۔ ایک پاؤں اُٹھا کر سب کو دکھاتے تھے اور کہتے تھے۔ ممکن ہیں کہ جب تک ایک پاؤں کا سہارا نہ رہے۔ ہم کھڑے رہ سکیں۔ یہ کیا بات ہے۔ وہ اور بدبخت گم نام آمنّا و صدقنا کے دم بھرتے تھے۔ اور تائید کر کے تقویت دیتے تھے۔ مگر شاہ فتح اللہ باوجودیکہ بادشاہ دم بدم اُس کی طرف دیکھتے تھے اور مطلب بھی اسی سے تھا۔ کہ نیا آیا ہوا تھا۔ اور اُسے پھانسنا منظور تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ چپ سُنے جاتا تھا۔ ایک حرف نہ بولتا تھا۔ دربار

اکبری کے دیکھنے والے اُن کے حال سے اُس عقیدت اور خدمت گذاری کا
سبق پڑھیں جس سے باوجود کہ ملازمت کے عظمت اور اعتباروں میں
کبھی پُرانے نمک خواروں سے پیچھے نہ رہے۔

۹۹۳ھ میں عضدالدولہ میر فتح اللہ امین الملک ہوگئے۔ حکم ہوا کہ راجہ
ٹوڈرمل سرف دیوان کل مہمات مالی و ملکی اِن کی صلاح و صواب دید فیصل کیا
کریں۔ شاہ موصوف کو یہ بھی حکم دیا کہ مظفرخاں کے عہد دیوانی کے بہت سے
معاملے ملتوی پڑے ہیں۔ انھیں فیصلہ کرکے آگے کے لئے رستہ صاف کردو
اور جو باتیں قابل اصلاح معلوم ہوں۔ عرض کرو۔ انھوں نے مشتبہ مقدمات
کو نظر غور سے دیکھا۔ نہ دفتر و اہل دفتر کی رعایت کی۔ نہ اہل مقدمہ کا لحاظ کیا۔
دونوں سے بے لگاؤ ہوکر امور اصلاح طلب کی ایک فہرست تیار کی۔ ...
آسانی کے لئے اپنی رائے بھی لکھی۔ وہ دفتری جھگڑے۔ تحصیل مالی۔ تنخواہ
سپاہی اور مقدمات دیوانی کے جنجال ہیں۔ دربار اکبری میں جانے قابل نہیں
آزاد انھیں یہاں نہیں لاتا۔ اتنا ضرور ہے کہ نکتہ رسی کی کھال اتاری ہے۔ اور
موشگافی کا تیل نکالا ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا تھا حرف بحرف منظور ہوا۔ اور
کاغذ مذکور اکبرنامہ میں داخل ہوا۔

اسی سنہ میں تسخیر دکن کا ارادہ ہوا۔ خان اعظم کوکلتاش خان کو سپہ سالار
کیا اور امرائے عظام کو لشکر و افواج کے ساتھ اُدھر روانہ کیا۔ شاہ فتح اللہ

مدت تک اُس ملک میں رہے تھے۔ اور ایک بادشاہ کے مصاحب خاص ہوکر رہے تھے۔ اس لیے صدارت کل ہندوستان کی ان کے نام ہوگئی۔ پانچ ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا فرما کر اعزاز بڑھایا اور حکم دیا۔ کہ اس ہم میں جائیں۔ اور اُمرا میں اس طرح ہوں۔ جیسے نولکھے ہار میں بیچ کا آویزہ۔ مُلّا صاحب لکھتے لکھتے خفا ہوکر کہتے ہیں۔ کمالائے شیرازی اس کے نوکر کو اس کی نیابت پر رکھ لیا کہ ائمہ مساجد جو خال خال مقطوع الاراضی رہ گئے ہیں۔ اُن کا بھی کام تمام کردے۔ اَب صدارت کمال کو پہنچی۔ رفتہ رفتہ یہ ہوگیا۔ کہ شاہ فتح اللہ اس اختیار اور جاہ و جلال پہ پانچ بیگھہ زمین کے دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ بڑی بڑی زمینیں ضبط کرنے میں کفایت سرکار سمجھتا تھا۔ وہ زمینیں بھی ویران ہوکر ویسے ہی دام ودد کا مسکن ہوگئیں نہ اِن اماموں کی ہوئیں۔ نہ رعیت کی۔ اِن کی مظلمی صدروں کے نامۂ عمل میں رہ گئی۔ اور ان کا بھی نشان نہ رہا۔

دکن کی داستان طویل ہے مختصر کیفیت یہ ہے۔ کہ راجی علی خان خاندیش کا پرانا فرماں روا تھا۔ اور فوج و خزانہ۔ عقل و تدبیر اور بندوبست ملکی سے ایسا چست و درست تھا کہ تمام دکن اُس کی آواز پر کان لگائے رہتا تھا اور وہ سلاطین و امرا میں دکن کی کنجی کہلاتا تھا۔ شاہ فتح اللہ بھی اُس ملک میں رہ کر آئے تھے۔ اور علاوہ علم و فضل کے اُمور ملکی میں

قدرتی مہارت رکھتے تھے۔ اور حکام و امرائے ہر طرح کی رسائی حاصل تھی
اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کیا۔ بہت سے امرا صاحب جمل و علم
با فوج و لشکر ساتھ گئے۔ میر موصوف کو ہمراہ کیا۔ کہ ہو سکے تو راجہ علی
خان کو لے آئیں۔ یا راہِ اطاعت پر لائیں۔ اور اس کے علاوہ [illegible]
امرا سرحدی کو بھی موافقت پر مائل کریں۔ لیکن خان اعظم کی بے تدبیری
اور سینہ زوری سے مہم بگڑ گئی۔ [دیکھو ان کا حال] شاہ فتح اللہ [illegible]
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ ناچاری اور ناکامی سے
کاروان میں شامل ہو کر خان خاناں کے پاس چلے گئے۔ [illegible]
گجرات میں بیٹھے۔ اور اطراف و جوانب میں کاغذ کے گھوڑے دوڑا
گے۔ مطلب یہ تھا کہ جو کام خان اعظم کو ساتھ لے کر کرنا تھا۔ وہ
ہم خان خاناں کو لے کر کر لینگے۔ اور عجب تھا۔ [illegible]
کو پہنچے۔

سنہ ۹۹۳ھ میں اکبر نے توران کو اپنی تیغ کی [illegible]
احتیاطاً لاہور میں ٹھیرا۔ ساتھ ہی کشمیر پر مہم شروع ہوئی۔ [illegible]
اہل مشورہ میں یہ نکتہ تنقیح طلب تھا۔ کہ توران پر مہم [illegible]
کہ اول میں معاملہ قندھار کا تھا کہ اس پر فوج کشی [illegible]
سندھ کو فتح کرکے آگے بڑھنا چاہیے۔ یا اسے کنارے چھوڑیں [illegible]

قندھار پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ خان خاناں اور شاہ فتح اللہ کو بھیجا کہ اُن کی رائے پر بھی بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اونٹ اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر دوڑے۔ اور مہینوں کی منزلیں پندرہ دن میں لپیٹ کر لاہور میں آن داخل ہوئے پھر انھیں دربار سے جدا کیا۔

۹۹۷ھ کے حالات میں ملا صاحب فرماتے ہیں کہ میں جو رامائن کا ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک دن [بادشاہ نے] اس کا خیال کر کے حکیم ابوالفتح سے فرمایا کہ یہ شال خاصہ اسے دے دو۔ کہہ دو کہ گھوڑا اور خرچ بھی ملیگا۔ شاہ فتح اللہ عضدالدولہ کو حکم ہوا کہ بساور درست تمھاری جاگیر رہی۔ ائمہ مساجد کی جاگیریں بھی تمھیں عنایت ہوئیں اور میرا نام لے کر فرمایا کہ اس بداؤنی جوان کی مدد معاش ہم نے بساور سے بداؤں کو منتقل کر دی۔ شاہ فتح اللہ نے ہزار روپیہ کے قریب تفصیلی میں پیش کئے۔ [اصل بات تھی کہ] اس کے شقدار (تحصیلدار) نے بطور تغلّب کے بیوؤں اور یتیمانِ نامراد کے حق میں پرگنہ بساور میں ظلم و تعدّی سے بچائے تھے۔ تہمت یہ کہ ائمہ حاضر نہیں۔ شاہ نے [مضمون رنگارنگ بدل کر] کہا کہ میرے عاملوں نے ائمہ کے حساب میں یہ روپیہ بطور کفایت نکالا ہے۔ فرمایا۔ بشما بخشیدم۔ غرض شاہ نے مجھے فرمان درست کر کے دے دیا اور تین مہینے نہ گذرے تھے کہ شاہ گذر گئے۔

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ہمرکاب کشمیر کو گئے اور جاتے ہی بیمار ہوگئے
رفتہ رفتہ بیماری نے طول کھینچا۔ اِن کے خلوص وفاداری اور فضائل و کمالات
اور اکبر کی محبت و مرمت کا وزن اکبرنامے کی عبارت سے معلوم ہوسکتا ہے۔
شیخ لکھتے ہیں کہ بادشاہ خود عیادت کو گئے اور بہت تسلی و دلداری کی۔
چاہتے تھے کہ ساتھ لے کر چلیں۔ مگر ضعف نوہی ہوگیا تھا۔ اس لئے خود
کابل کو روانہ ہوئے۔ حکیم علی کی رائے میں خطا معلوم ہوئی۔ اس لئے
حکیم حسن کو ان کے پاس چھوڑ آئے۔ اثنائے راہ میں حکیم مصری کو بھی بھیجا
کہ معالجے میں رائے شامل کریں۔ افسوس کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے
ملک بقا کو روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ اور زبان سے
یہ الفاظ نکلے۔ کہ میر ہمارے وکیل تھے۔ طبیب تھے منجم تھے۔ جو ہمارے
دل کو صدمہ ہوا ہم ہی جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون معلوم
کرسکتا ہے۔ اگر اہل فرنگ کے ہاتھ میں میر جا پڑتے اور وہ قدر
ناشناس اس کے عوض میں تمام خزائن بارگاہ سلطنت کے مانگتے
توہم بڑی آرزو سے سودا کرلیتے کہ بڑا نفع کمایا اور جواہر بے بہا بہت
ارزاں خریدا۔ بہ حیران انجمن ہستی (بندۂ ابوالفضل) لکھا ہوا تھا کہ
گل علمی کا کارواں لُٹ کر رستہ بالکل بند ہوگیا۔ اس معنوی بزرگ
اور کر رائے بدلی تھی۔ اس سرمایہ علم پرراستی۔ درستی۔ معاملہ دانی ہیں

گوہر نایاب تھا۔ حکم ہوا کہ سید علی ہمدانی کی خانقاہ سے اٹھا کر کوہ سلیمان کے دامن میں سُلادوں۔ کہ دل کشا مقام ہے۔ ان دنوں میں بعض امرا کو امورات سلطنت کے باب میں جو فرمان ہوئے ہیں۔ ان میں بھی شاہ کے مرنے کا حال بہت افسوس کے ساتھ لکھوایا ہے۔

ملّا صاحب نے جس طرح ان کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سوچتا رہ گیا۔ کہ ایسے صاحب کمال کے مرنے کا افسوس کروں یا ملّا صاحب کی بے دردی کا ماتم کروں۔ جس خیال سے انھوں نے اس واقعہ کو لکھا ہے فرماتے ہیں۔ ان دنوں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی نے کشمیر میں تپ محرق پیدا کی۔ خود طبیب حاذق تھا۔ علاج یہ کیا کہ ہریسہ کھایا۔ ہر چند حکیم علی منع کرتا تھا۔ مانتا نہ تھا۔ آخر اجل کا تقاضی گریبان پکڑ کر کھینچتا کھینچتا دار بقا کو لے گیا۔ تخت سلیمان میں کہ شہر کشمیر کے پاس ہی ایک پہاڑ ہے۔ سیّد عبد اللہ خان چوگان بیگی کی قبر کے پاس دفن ہوا۔ تاریخ ہوئی۔ فرشتہ بود۔ خیر گذر گئی کہ گول مول عبارت غصہ نکل گیا۔ ملّا احمد اور میر شریف آملی کو اور جہاں کوئی اُن کے پلے پڑ گیا ہے۔ وہ صلواتیں سنائی ہیں۔ کہ خدا کی پناہ۔ فحش کے مشاہرے کی گواہی دے گئے ہیں۔ آملی کی تیز طبیعت کا یہ عالم ہے۔ کہ شیعہ کا نام سنتے ہی غصہ آجاتا ہے۔ شکرانہ بجالاؤ کہ فضائل علمی اور اوصاف کمالات

کو خاک سیاہ نہ کر دیا۔ خیر تھوڑی خاک ڈال دی۔ اس کا تعین بھی خیال
نہ کرنا چاہیے جو کچھ عنایت ہوئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر
علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ اس لیے ملا صاحب کے علم
دوست دل میں محبت کو گرمایا۔ اور شیعہ بھی تھے۔ مگر جہاں جہاں ان
کا ذکر آیا ہے، اس سے بے تہذیبی یا کسی غیر مذہب کے باب میں
بدکلامی نہیں پائی گئی۔ اپنے مذہب کو علم و فضل کی شاہی سے لیے آہستگی
و شائستگی کے ساتھ نکل گئے۔ اس لیے با انصاف مورخ کا قدم بھی
بدی کے الفاظ کو لے گیا۔ میرے شیعہ بھائی سلامت رہیں اور
اہل بیت کا رستہ ان لوگوں سے سیکھیں لیکن ملا صاحب بھی زبردست
ملا ہیں۔ جرم تشیع کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور دینی چاہیے تھی۔ یہی کہہ دیا کہ
اتنا بڑا عالم ہو کے بادشاہ کے ساتھ شکار میں دوڑتا پھرتا ہے۔ امرا
کے گھر جا کر ان کے لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ شاگردوں کو تو برا بھلا
کہا جاتا ہے۔ کوئی شاگرد صاحب کمال اس کے دامن سے پل کر
نہیں نکلا۔ اچھا حضرت یہ بھی غنیمت ہے۔

بزرگان با خبر سے معلوم ہوا ہے کہ شاہ مرحوم کاغذات پر جو دستخط
کرتے تھے تو فقط فتحی یا فتحی شیرازی لکھا کرتے تھے۔ فتح سے اختصار
مقصود تھا یا تخلص ہوگا۔ شاید شعر بھی کہتے ہونگے۔ مگر کوئی شعر معلوم

یا کانوں سے نہیں گذرا۔
ذات کا حال فقط اتنا ہی معلوم ہے کہ سید تھے۔ ملا صاحب نے بھی
اتنا ہی لکھا ہے کہ سادات شیراز سے تھے۔ نہ معلوم ہوا کہ کس امام کی اولاد میں سے
اور کس خاندان سے منسوب تھے اور عمر کیا پائی۔ پہلے شاہ فتح اللہ مشہور تھے اکبر
میر فتح کہنے لگا۔ اس لئے تھوڑے مورخ میر فتح اللہ لکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا
سلسلہ شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ خواجہ جمال الدین محمود
مولانا کمال الدین شروانی۔ مولانا احمد کُردسے بہت علم حاصل
کیا مگر عقل و فہم کو اُن سے بہت اونچے درجے پر جا رکھا۔ مُلاّ
صاحب نے مولانا غیاث الدین کا شاگرد لکھ کر جو کچھ کہا دیکھ ہی
لیا۔ اور پھر زمرۂ علماء میں درج کرکے فرماتے ہیں۔ اعلم علمائے
زماں مدتوں حکام و اکابر فارس کا پیشوا رہا۔ تمام علوم عقلی و نقلی
حکمت ہیئت ہندسہ نجوم۔ رمل۔ حساب۔ طلسمات۔ نیرنجات۔
جرِ اثقال خوب جانتا تھا۔ اس فن میں وہ رتبہ رکھتا تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ
ہوتے تو رصد باندھ سکتا تھا۔ (خصوصاً کلوں کے کام میں بہت
خوب ذہن لگتا تھا) علوم عربیہ اور حدیث و تفسیر میں بھی نسبت
سادات تھی۔ اور خوب خوب تصنیفات کی تھیں۔ مگر ملا مرزا جان
شیرازی کے برابر نہیں جو ماوراء النہر میں مدرس یکتا۔ پرہیزگار

یگانہ روزگار ہے۔ میر فتح اللہ اگرچہ مجلسوں میں نہایت خلیق متواضع نیک نفس تھے۔ مگر اس عبارت سے خدا کی پناہ ہے۔ کہ جب پڑھا رہا ہو۔ فحش الفاظ رکیک اور ہجو کے سوا شاگردوں کے لئے کوئی بات زبان پر آتی ہی نہ تھی۔ اسی واسطے لوگ اُس کے درس میں کم جاتے تھے۔ اور کوئی شاگرد رشید بھی اُس کے دامن سے نہ اُٹھا چند روز دکن میں رہا۔ عادل خاں وہاں کے حاکم کو میر سے عقیدت تھی۔ ملازمت بادشاہی میں آیا تو عضد الملک خطاب پایا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں مرگیا۔

آپ کی فضیلت اور قابلیت کا نمبر ملّا صاحب نے یہ لگایا ہے۔ شیخ ابو الفضل نے وہ فقرہ لکھا ہے۔ اور پھر ایک مقام پر اس سے بھی بڑھ کر لکھا۔ اگر علوم عقلی کی پرانی کتابیں نابودی کی رونق پر جائیں تو نئی نئی بنیاد رکھ دیتے۔ اور جو کچھ گیا اس کی پروا نہ کرتے۔ جوہر عالی تھا اور اعلیٰ ذات تھے۔ یا وہ حکمت رہی بچی ہوئی تھی اور عقل مروجہ نے حق تلاشی کی آنکھ پر پردہ نہ ڈالا تھا۔ محمد شریف معتمد خاں بھی اقبال نامہ میں لکھتے ہیں۔ علمائے متاخرین میں میر فتح اللہ اور ملّا مرزا جان کی برابر کوئی نہیں ہوا۔ مگر میر کی تیزی فہم اور قوت ادراک ملّا پر فائق تھی۔ اگر آج تینوں صاحب موجود ہوتے تو

آمنے سامنے بٹھا کر باتیں سنتے اور تماشا دیکھتے۔
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے ٭ ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے
مگر ملا صاحب کے سامنے کس کا منھ تھا جو بول سکتا۔ سب طرف سے بند ہوتے تو کافر ہی بنا کر اڑا دیتے۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر فن میں شاہ کی اچھی اچھی تصنیفات تھیں۔ مگر افسوس کہ آج کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو ہے وہ سند ہے۔

ایک رسالہ حالات کشمیر میں عجائبات کشمیر لکھا تھا۔ وہ حسب الحکم اکبرنامہ میں داخل ہوا۔

خلاصۃ المنہج۔ ایک مشہور تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ملا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے۔

منہج الصادقین۔ ایک مفصل اور مبسوط تفسیر کہ چھاپ بلکہ ہند میں نایاب ہے۔ شیخ ابو الفضل نے اکبرنامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے کہ علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں اور ایک تفسیر بھی مفصل لکھی تھی۔

"تاریخ الفی" کی تالیف میں بھی شامل کئے گئے۔ اور سال دوئم تحریران کے سپرد ہوئی (دیکھو ملا صاحب کا حال) زیج جدید تاریخ الٰہی اکبرشاہی کا ایک حصہ اُن کی زیر نگرانی لکھا گیا۔ دیکھو آئین اکبری۔

علمی یا دفتری اصلاحیں جو اُن کی رائے روشن سے ہوئیں ان

میں ہے :-

(۱) سنہ الٰہی اکبر شاہی کو سال و ماہ اور ایام کی کمی بیشی کا حساب کر کے تاریخ قرار دی ۔ یہ تبدیلی ۹۹۲ھ میں واقع ہوئی ۔ مگر اس عہد کی کل تصنیفیں اور بادشاہی تحریریں اسی کی بنیاد پر ہیں ۔ اور اسے مبارک سمجھ کر خاندان چغتائی کے تخت نشین اکثر اس کی پابندی کرتے رہے ۔

(۲) اکبر کے زائچہ پر نظر ثانی کی ۔ اور یونانی اور ہندی پر اس میں جو اختلاف تھا اس کا سبب نکال کر دونوں میں مطابقت ثابت کی ۔

(۳) دفتر مال اور دیوانی میں سب ایجادوں یا اصلاحوں کے پھول لوگوں نے راجہ ٹوڈرمل کی دستار پر سجائے ان میں کچھ پنکھڑیاں ان کا بھی حق ہے ۔ ابوالفضل کی عبارت پر خیال کرو ۔ جو شخص حکمت یونان کا نظام نیا باندھ سکتا ہو جب دفتر حساب اور معاملات و مقدمات پر متوجہ ہو جائے تو کون سا پیچ ہو گا کہ اس سے رہ جائے گا اور اس میں جو نکتہ وہ عالی طبع نکالے گا ۔ کیسا برجستہ ہو گا ۔ آئین اکبری کا جزو اعظم ہو گا ۔

(۴) ان کی ایجادوں کا طلسمات دیکھنا چاہو تو نشہ کے نو روز کا مینا بازار جا کر دیکھو ۔ تمام امرا نے اپنے اپنے شکوہ و شان کی دکانیں

سجا رکھی ہیں۔ میر موصوف سامان مذکور کے ساتھ اپنی طبع رسا کی
نمائش گاہ ترتیب دئے بیٹھے ہیں۔

(۱) بادآسیا۔ یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے۔

(۲) آئینۂ حیرت۔ نزدیک و دور کے عجائب غرائب تماشے
دکھا رہا ہے۔

(۳) جر اثقال کے آواز چرخیان۔ پتلے برابر چکر لگا رہے ہیں۔

(۴) علم نیرنجات۔ کیمیائی ترکیبوں سے جادو کر رہا ہے۔

(۵) توپ ہے کہ تخت پر چڑھی ہے۔ توپ جنسی (قلعہ شکن) توپ
ہے۔ پہاڑ سامنے آجائے تو چڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ۔ ہاتھوں
ہاتھ اٹھا کر چڑھ جاؤ۔

(۶) بندوق۔ ہے کہ ایک فیر میں ۱۲ گولیاں مارتی ہے۔

ملا صاحب ان پر بہت خفا ہیں۔ کہ بادشاہ کی مصاحبت
اور خوشامدوں میں علم کی شان کو بٹا لگایا۔ یہ اعتراض بیجا نہیں۔
البتہ مکدر الفاظ اور غلیظ عبارتوں میں ادا ہوا۔ کیونکہ جس دل سے
نکلا تھا۔ وہ بھی مکدر تھا۔ ملا صاحب تو یہ چاہتے ہیں کہ جو صاحب
علم ہو تارک الدنیا ہو۔ جبہ پہنے۔ مصلا بچھائے۔ تسبیح لئے خانقاہ
میں خلوت نشین رہے۔ مریدوں میں نکل کر بیٹھے تو مثنوی شریف کا

درس کہے اور زار زار روئے۔ کشف کرامات کا دعویٰ نہ ہو۔ یہ لوگ وہ کہ یونان حکمت میں جائیں تو اس طور سے سمجھیں اور سمجھائیں۔ منقولات میں دیکھو تو مفسر، محدث، مجتہد۔ یہ سمجھ گئے تھے کہ قوم ڈوبی جاتی ہے۔ بادشاہ بے علم ہے۔ اور بے قوت ہے۔ ہم اس کے دست و بازو بن کے شامل حال نہ ہوں گے۔ تو ملک کو ڈبو دینگے۔ اور نہ فقط دنیا بلکہ دین بھی ڈوب جائیگا۔ اس لئے اپنے آرام اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اس کی خدمت اور مصلحت خلق اللہ خدا ترس پر فدا کر دیا تھا۔ اور بادشاہ بھی اکبر بادشاہ جیسا قدردان۔ اور چاہنے والا تھا۔

طبیعتیں ایسی شگفتہ لائے تھے۔ کہ جس رنگ میں چاہیں۔ ویسے ہی ہو جائیں۔ جس خیال میں اپنے آقا کو خوش دیکھتے تھے۔ اس کے پتلے بن جاتے تھے۔ میرے دوستو! بھلا مچھلی دریا کے بغیر جی سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ایسے عالم تصنیف، تالیف اور درس و تدریس بغیر خوش رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن کیا کریں کہ مصلحت وقت سے مجبور تھے۔ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی سے کسی نے کہا کہ آپ حج کو کیوں نہیں جاتے ہو فرمایا جو فیض ہماری ذات سے یہاں رہنے میں پہنچتے ہیں۔ وہ بند ہو جائینگے۔ اور ان کا ثواب

حج سے زیادہ ہے۔ غرض سنہ ۹۹۱ھ میں آئے اور سنہ ۹۹۷ھ میں چلے گئے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ۔۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

۷ برس ہندوستان کی سیر کی اور اپنے کمالات کی بہاریں عالم کو دکھا گئے۔ فی الحقیقت مدت خدمت بہت کم تھی۔ مگر تاریخی بیان اور خود اکبر کی زبان کے جو الفاظ ہیں۔ اُن پر خیال کرو معلوم ہوتا ہے کہ اعتبار اور محبت میں جو مصاحب خاص اور عمروں کے جان نثار تھے۔ اِن میں اِن کا نمبر کسی سے پیچھے نہ تھا۔ یہ خلاصۂ روزگار ابوالفضل فیضی حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام تھے۔ اور بیربر کا تو کیا کہنا ہے۔ وہ تو بادشاہ کی دل لگی بلکہ زندگی کا کھلونا تھا۔ ٹوڈر مل نے کارگذاری و مزاج شناسی سے اعتبار کے ساتھ دل میں گھر کیا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان پہلے انھیں چاروں میں پانچویں سوار تھے۔ اور مان سنگھ چھٹے پھر مہمات ملکی کے ہیر پھیر میں آکر دُور جا پڑے۔ کوکلتاش خان دودھ کے زور سے ہر مقام پر جگہ لیتے تھے۔ اور اکبر بھی چاہتا تھا۔ کہ یہ ویسے ہی ہوں مگر اُن کی بے دماغی۔ بلند نظری۔ خود پسندی اور دعویدار زبان ایسی تھی کہ ان لوگوں میں نہ رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ فتوحات کی ہوا میں اُڑکر کہیں کے کہیں جا پڑے۔ میر فتح اللہ نے اپنی لیاقت اور مزاج دانی

اور آداب و نیاز اور خلوص وفاداری سے اول کے چار نمبروں میں جگہ لی۔ یہ اشخاص اکبر کی جزو زندگی ہو گئے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا کہ باوجود فضل و کمال کے اپنی طبیعت کی خواہش اور ہر طرح کے ذوق و شوق کو اس کی خدمت گذاری اور مصالح ملکی اور دل کی خوشی پر فدا کر بیٹھے تھے

ایک باریک نکتہ اس میں یہ ہے۔ کہ مدت دراز سے چند عالموں نے شریعت کے زور سے سلطنت کی گردن کو دبا رکھا تھا۔ یہ لوگ گویا گھر کے غنیم تھے۔ اور ان کا توڑنا سب سے مہم عظیم۔ ان کا زور فوج و لشکر کے بس کا نہ تھا۔ اگر توڑ سکتے تھے۔ تو اپنے وفاداروں کی تدابیر عقلی اور دلائل علمی کی فوج انھیں توڑ سکتی تھی۔ چنانچہ کچھ قدرتی اتفاقات نے کچھ ان لوگوں کی تدبیروں نے توڑ پھوڑ کر ستیاناس کر دیا۔

یہ لوگ اپنی لیاقت اور خدمت کے سوا کسی کو رفیق نہ پاتے تھے۔ اس لئے جان توڑ کر لپٹ جاتے تھے۔ اور سچے اخلاص و نیاز سے خدمت بجالاتے تھے۔ اُن کے وطن کی غربت اور فاضیان دربار کے ساتھ جو مذہب کا اختلاف تھا۔ وہ بادشاہ کے سامنے تائید کرتا تھا۔ کہ غنیموں سے مل کر سازش نہ کرینگے۔ اور یہ خاص اُن کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور ایرانی امرا سے کوئی بے وفائی

بھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ بلکہ حق پوچھو تو جو خرابی ہوئی ملک موروثی کے نمک خواروں سے ہوئی۔ بیرم خان اور خان زماں سے جو کچھ ہوا وہ ظاہر ہے۔ لڑنے والے نے خواہ مخواہ لڑا دیا۔ اہل ایران نے کوئی مرتبہ جاں نثاری کا نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے اکبر اُن لوگوں کو عزیز رکھتا تھا۔ اور پورا پورا اعتبار تھا۔ بلکہ اس سلطنت کی محبت ان کے ساتھ رکھتا تھا کہ الفاظ و عبارت اس کی کیفیت ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس پھول کی مہک کا ایک نمونہ دکھاتا ہوں۔ ذرا خیال کرو۔ کہ قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔ تو دل میں کیا کچھ ہوگا۔ اور صحبتوں میں کیا باتیں ہوتی ہونگی۔

شیخ فیضی سفارت دکن کی عرائض میں سے ایک عرضی میں ایران کے حالات لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔ ترجمہ آج کل سر آمد دانشمندان عراق و فارس میر تقی الدین محمد ہے۔ مشہور یہ تقیا کے نسابہ۔ ولایت میں آج اس کی عقل و دانش کو کوئی نہیں پہنچتا۔ یہ میر فتح اللہ کے شاگردوں میں سے ہے۔ جب میر فتح اللہ اور مولانا مرزا جان شیراز میں دانشمندی کا نقارہ بجا رہے تھے۔ تو یہ بھی شیراز کے مدرسوں میں سے تھا۔ قدیمی مدتوں سے اس کے کمالات کا شہرہ سُن رہا ہے۔ اور میر فتح اللہ سے کررّ تعریف

منی ہے۔ جس کا ایسا شاگرد یادگار ہو اس کے کمال کی دلیل اہل عالم کے لئے
کافی ہے۔ ملا محمد رضا کہ ہمدانی شیرازی یہاں آیا ہے۔ مدرسے کے
دماغ سوختوں میں سے ہے۔ فضیلت اور اہلیت کا جوہر ظاہر ہے۔
وہ کہتا تھا۔ میر تقی الدین محمد کو حضور کے آستان بوسی کی آرزو ہے۔
زاد راہ بہم نہ پہنچا۔ اور موقع ہاتھ نہ آیا۔ ورنہ اس قافلہ میں آتا۔ عالم
پناہا! اگر فرمان عالیشان کچھ انعام کے ساتھ بھیجا جاوے تو اُس کی سرفرازی
ہے۔ میر فتح اللہ کی یادگار ہے۔ اور اُس کا فرزند معنوی ہے۔
سمجھ لو کہ اکبر کے دل میں محبت کا کیا عالم ہوگا۔ جو اس مزاج
دان کی تحریر سے یہ رنگ جھلکتا ہے۔ طبع فیاضی کی مرثیہ خوانی
شاہ فتح اللہ شیرازی کے غم میں ہے۔

فارغی۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ میر فتح اللہ کے بھائی تھے۔
اول بیرم خاں کے عہد میں یہاں آئے۔ خان موصوف نے کہا
کہ یہ تخلص شیخ عبدالواحد خرانی کا ہے۔ اور مشہور ہوچکا ہے۔ مجھے
اُن سے ارتباط اور نہایت اعتقاد تھا۔ تم فائقی تخلص کر لو۔
چند روز ان کی فرمائش کی تعمیل کی۔ ایران میں جاکر فائقی پھر
فارغی ہوگئے۔ دوبارہ ہندوستان میں آئے اور مرگئے۔ اُن کے
بیٹے میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کے مسند نشین تھے۔

میں نے تھوڑا سا رسالہ بیت بابی اُن سے پڑھا تھا۔ اعلیٰ درجہ کا فہم و ذکا اور ہمت عالی رکھتے تھے۔ اِن کے بھائی میر شریف تھے۔ فضائل و کمالات کے اوصاف سے موصوف تھے۔ میر نقی کہتے تھے۔ کہ ہمارے کل خاندان میں ایک یہ بھائی سنت و جماعت ہیں شاہ فتح۔ باقی سب شیعہ غالی ہیں۔

آزاد۔ شاہ فتح اللہ کو تم جانتے ہو۔ ان سے زیادہ کوئی شیعہ کیا ہوگا۔ مگر تنگا منہ عالم سے کیا بچ کر نکل گئے۔

آصف خان

خواجہ عبدالمجید کو بعض کتابوں میں یزدی لکھا ہے اور بعض میں
ہروی۔ خدا جانے یزد وطن تھا یا ہرات۔ (سیر المتاخرین) میں لکھا
ہے کہ حضرت زین الدین خوافی کی اولاد میں تھے۔ امیر تیموران
سے کمال اعتقاد رکھتے تھے اور فی الحقیقت ان کی دعا سے انہیں
بڑے فیض و برکات پہنچے تھے۔ ماثر الامرا میں ہے کہ آصف خان
شیخ ابوبکر کی اولاد میں تھے۔ اور وہ امیر تیمور کے عہد میں
فقیر صاحب دل تھے۔ جب ۷۸۲ھ میں امیر تیمور ملک غیاث الدین
حاکم ہرات پر فوج لے کر چلے تو تائباد میں مقام کیا۔ شیخ ابوبکر
کے پاس آدمی بھیجا۔ اس نے جا کر کہا کہ "چرا بہ تیمور ملاقات نمیکنی"
انھوں نے کہا مرا با او چہ کار۔ امیر خود گیا۔ اور کہا کہ شیخ چرا
ملک نصیحت نہ کردی۔ شیخ نے کہا نصیحت کردم نشنید۔ خدا
تعالیٰ تمھارا برو گماشت۔ اکنون شمارا نصیحت می کنم بعدل اگر نشنوی
دیگرے برشما گمارد۔ تیمور کہا کرتا تھا کہ سلطنت میں بہت فقرا
سے صحبتیں ہوئیں۔ ہر شخص کے دل میں میری طرف سے کچھ خطرہ
ہوتا تھا مگر شیخ مذکور میں دیکھتا تھا کہ میرے دل میں اس کی

طرف سے لحاظ معلوم ہوتا تھا) قوم تاجیک تھے۔ مگر میدان جنگ میں
ایسے کارہائے نمایاں کیے کہ ترکوں سے ایک قدم پیچھے نہیں رہے۔
اوّل ہمایوں کے پاس اہل قلم کے سلسلہ میں تھے پھر اکبری خدمت
میں آئے۔ جب بادشاہ دلّی سے بیرم خان کی مہم پر چلے تو
انھیں آصف خان خطاب دیکر دہلی کا حاکم کر گئے۔ چند روز میں سہ ہزاری
منصب سے بلند ہوئے۔ فتو عدلی کا غلام قلعہ چنار گڈھ پر قابض
تھا۔ ان کے نام حکم ہوا۔ یہ شیخ محمد غوث گوالیاری کو ساتھ لیکر
گئے اور صلح کے ساتھ قلعہ مذکور پہ قبضہ کیا۔ دربار سے کڑہ مانک
پور بھی عنایت ہوا۔ سنہ [illegible]ھ میں غازی خاں تنور سے (امرائے عدلی
میں تھا) کڑہ پہ میدان مار کر فتحیاب ہوئے۔ وہ ولایت بھٹہ میں راجہ
رام چند کے پاس بھاگ گیا۔ انھوں نے ادھر گھوڑے اٹھائے۔ راجہ مقابلہ
پر آیا۔ آصف خان نے مارتے مارتے قلعۂ مانڈو میں ڈال کر محاصرہ
کر لیا۔ راجگان ہند حاضر دربار ہونے لگے۔ ان کی سفارش سے
اُس کی خطا معاف ہوئی۔

ملک بھٹہ کے جنوب میں گڈھہ کٹنکہ کا ملک ہے (ملا صاحب کہتے
ہیں) گڈھہ کٹنکہ کا ملک آبادانی و فراوانی سے مالا مال اور (جس میں قوم
گونڈ آباد ہے) ۷۰ ہزار آباد گاؤں سے معمور ہے۔ چورا گڈھ اس کا

دارالحکومت ہے۔ پہلے قلعہ ہوشنگ آباد پایہ تخت تھا۔ وہ سلطان ہوشنگ
غوری بادشاہ مالوہ نے تعمیر کیا تھا۔ سنہ ۹ جلوس میں ۱۰ ہزار لشکر لے کر
آصف خان ہوشنگ آباد پر گیا۔ رانی درگاوتی خردسال بیٹے کو لئے فرمانروائی
کرتی تھی اور شجاعت اور دانائی سے عورتوں میں نظیر نہ رکھتی تھی۔
سلطنت کے سارے کام مردان عالی فطرت کی طرح سرانجام کرتی تھی
گھوڑے پر چڑھتی تھی شکار کھیلتی تھی۔ تیر مارتی تھی۔ میدان جنگ میں
کارنامے دکھاتی تھی۔ دربار عام میں بیٹھ کر مہمات سلطنت طے
کرتی تھی اور لوازم ملک داری کو تدابیرِ درست کے ساتھ عمل میں
لاتی تھی۔ اس موقع پر ۲۰ ہزار سوار سات سو ہاتھی لے کر لڑنے کو نکلی
اور میدانِ ہمت میں قدم جما کر مردوں کے مقابل ہوئی وہ ہاتھی
پر سوار قلب لشکر میں کھڑی تھی۔ فوج کو لڑاتی تھی۔ اور آپ
تیر مارتی تھی۔ اس نے خود ہی ایک تیر کھایا۔ جو حقیقت میں
قضا کا تیر تھا۔ اسے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو زندہ گرفتار ہو جاؤں
فیلبان سے کہا کہ اخیر میں حق نمک یہی ہے کہ خنجر سے میرا کام تمام
کردے تاکہ پردۂ ناموس رہ جائے۔ فیلبان نے کہا۔ مجھ سے یہ
نمک حرامی نہ ہوگی۔ جواں مرد عورت نے خود خنجر پکڑ کر دریائے خون
میں غوطہ لگایا اور ملکِ عدم میں جا کر سر نکالا۔ آصف خاں لشکر کی لوٹ کا

سے نجھیلے بھر کر شہر ہوشنگ آباد پر گیا۔ بن ماں باپ کا بچہ بھی سپوت نکلا۔ فوج لے کر میدان میں آیا اور تڑپ دکھائے بغیر ہرگز جان نہ دی۔ بہت پرانا راج تھا۔ اُس گھر کو پیٹ بھر کر لوٹا۔ ایک سو ایک صندوق فقط اشرفیوں کا۔ رُپوں کا شمار نہیں۔ چاندی اور سونے کے بے حساب ظروف و اسباب صدہا مورتیں طلائی اور جڑاو۔ اجناس گراں بہا جن کی فہرست حد تحریر سے باہر تھی۔ ہزار ہاتھی گنتش مورت خوبصورت۔ لدّو ہاتھیوں کا ذکر نہیں۔ گھوڑے باد رفتار سیکڑوں اُن میں سے کچھ کچھ چیزیں برائے نام بادشاہ کو بھیج دیں باقی ہضم۔ یہ دولت و مال سمیٹ کر عبدالمجید جو ابھی آصف خاں ہوئے تھے قارون و شدّاد بن گئے۔ مگر ساتھ ہی کھٹکا لگا تھا کہ ہائے! دربار کے مفت خورے مفت چھنوا دینگے۔ اور قلم قسائی آدھوں آدھ بیچ میں کھا جائینگے۔ دیوان اور اہل دفتر کے مراسلے آتے تھے کہ حاضر دربار ہوکر حساب سمجھاؤ۔ اور یہ پہلو بچاتا تھا۔ خان زماں کی پہلی چڑھائی پر بادشاہ نے بلایا تو حاضر ہو گیا۔

جب اُس نے سُنا کہ دوبارہ خان زماں بگڑا ہے اور امرائے بادشاہی اُس سے ٹکر کھا کر بکھر گئے۔ تو وہ بڑے سامان کے ساتھ ہوشنگ آباد سے چلا۔ یہاں مجنوں خان مانکپور میں گھرے ہوئے

بیٹھے تھے۔ آصف خاں نے آکر اُنھیں محاصرہ سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دیئے۔ اُن کی سپاہ کی کمر بندھوائی۔ اور مجنوں خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ اُنھوں نے اپنے اپنے ہمراہیوں کے پروبال درست کئے اور دونوں مل کر خان زمان کے سامنے بیٹھ گئے۔ چونکہ اکبر کی بھی آمد آمد تھی۔ اس لئے خان زماں سوچ رہا تھا۔ کہ رن کا فیصلہ کرے یا توقف۔ آصف خاں اس موقع کو غنیمت سمجھتا تھا کہ یہ خدمت اگلی کدورت کو صاف کردیگی۔ مجنوں خاں وغیرہ اُمرا کے ساتھ اکبر کو عرضیاں لکھ رہا تھا کہ وہ بھی آن پہنچے۔ آصف خاں اور مجنوں خاں حاضر حضور ہوئے۔ آصف خاں نے پیشکش نذر گذرانا۔ خطا معاف ہوئی۔ نذرانہ قبول ہوا۔ اور سپہ سالار ہوکر خان زماں کے مقابلہ کے لئے رخصت ہوئے وہ نرہن کے گھاٹ پر اس کے مقابل جا اُترے۔

اب خیال کرو۔ اکبر تو جونپور میں پڑا۔ آصف خاں اور مجنوں خاں خان زمان کے سامنے کڑہ مانک پور پر فوجیں لئے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا کہ الٰی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھانا ہوگا۔ کہو وہ دشمنوں کو کیا کھلاؤگے۔ اور چورا گڈھ کے مال میں سے کیا تحفے دلواؤگے۔

اُسے کھٹکا تو پہلے ہی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شبہ ڈالا۔ کہ خان زماں کے مقابلے پر آنا فقط اپنا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے اور میدان سے اُٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ وزیر خان اس کا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سنتے ہی اُس کی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا کہ مورچہ قائم رہے اور شجاعت خان کو آصف خاں کے پیچھے دوڑایا۔ شجاعت خاں (وہی تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ) مانک پور پہنچ کر چاہتے تھے کہ دریا اتریں۔ آصف خاں تھوڑی دور بڑھا تھا جو خبر پائی کہ مقیم بیگ پیچھے آیا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا۔ آصف اپنی جمعیت اور سامان سمیت۔ فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا صبح کو انھیں خبر ہوئی۔ دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روے سیاہ کو دھویا اور پیچھے پیچھے دوڑے۔ ترک تھے مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا وہ نکل گیا۔ خیر جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن کر حاضر ہو گئے۔

جب اہل دربار کے لالچ نے اُسے بھی میدان وفاداری سے

ڈھکیل کر نکال دیا تو وہ جونا گڑھ میں جا بیٹھا۔ اسی عرصہ میں خان زماں
کی خطا بادشاہ نے معاف کر دی اور اس کی طرف سے خاطر جمع ہوئی
تو مہدی قاسم خاں کو آصف خاں کی گوشمالی کے لئے بھیجا۔ مجنوں خاں
کو کہ اس کے داماد بھی تھے، اور چند امرائے نامی کو حکم دیا کہ
فوجیں لے کر اس کے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلطان
سے لڑنا منظور نہ تھا۔ درگاہ میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی مگر یہاں
دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خان زماں کو خط لکھا اور آپ بھی چلا۔
حسرت و حرماں کی فوج کے ساتھ اس مقام سے بیٹھے اٹھا تھے۔
جسے اپنے بازو کے زور سے زیر کیا تھا۔ چنانچہ کڑہ مانک پور میں
جا پہنچا۔ خان زماں کے زخم دل ابھی ہرے بھرے تھے۔
جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا۔ آصف خاں دل میں
پچھتایا کہ ناحق یہاں کیوں آیا۔ ادھر جب مہدی قاسم خاں پہنچے۔ تو
میدان صاف دیکھ کر جونا گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اور آصف خاں کو
خان زماں کے ساتھ دیکھ کر پہلو بچا لیا۔ وہیں سے حج کو چلے گئے
یہاں خان زماں آپ تو دارالحکومت میں بیٹھے۔ آصف خاں سے
کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑو۔ بہادر خاں کو اس کے
ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے ساتھ رکھا۔

گویا دونوں کو نظر بند کر لیا اور نگاہ اُن کی دولت پر۔ وہ بھی مطلب
تاڑ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اندر اندر پیچ دوڑا کر صلاح
موافق کی۔ یہ اِدھر سے بھاگا۔ وہ اُدھر سے۔ کہ دونوں مل کر مانک
پور آ جائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا۔ جونپور اور مانک پور
کے بیچ میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خان پکڑے
گئے۔ بہادر خان اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈال کر روانہ ہوئے
اُدھر وزیر خاں جو جونپور سے آتا تھا۔ بھائی کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی
دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے۔ اور جو کچھ تھے لوٹ
میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے حریف کے حملہ کو روک نہ سکا۔
بھاگ نکلا۔ اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف خان کا فیصلہ
کر دو۔ وزیر خاں پیش دستی کر کے جا پہنچا۔ اور بھائی کو نکال
لے گیا۔ پھر بھی آصف خان کی دو تین انگلیاں اُڑ گئیں۔ اور
ناک بھی کٹ گئی۔ بادشاہ پنجاب میں دورہ کرتے تھے۔ انھوں
نے آگرہ میں مظفر خان تربتی کے پاس پیغام سلام دوڑائے
پھر وزیر خاں خود آن ملا۔ مظفر خاں نے حضور میں عرضی لکھی اور
انجام یہ ہوا کہ پہلے وزیر خاں حاضر ہوا۔ بادشاہ لاہور کے
پاس شکار کھیل رہے تھے وہیں ملازمت ہوئی۔ پھر آصف خاں

کی خطا بھی معاف ہوگئی ۔ خان زماں کی آخری مہم میں اس نے بڑی جاں فشانی دکھائی ۔ ۹۷۵ھ میں پرگنہ پپاگ کہ حاجی محمد خاں سیستانی کے نام تھا آصف خاں کو مرحمت ہوا ۔ اسی سال میں بادشاہ نے رانا پر فوج کشی کی ۔ اُس نے قلعہ چتّور جیمل کے حوالہ کیا اور آپ پہاڑوں میں بھاگ گیا ۔ آصف خاں نے اُس محاصرہ میں بھی فدویت کے جوہر دکھائے جب قلعہ مذکور فتح ہوا تو اُسی کی جاگیر میں مرحمت ہوا ۔



حسین قلی خانِ جہاں

(از دربارِ اکبری)

بیرم خان کا بھانجا، ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا تھا (ترکمانوں میں ایک نامور قبیلہ کا نام تھا) ولی بیگ نے بیرم خان کے ساتھ ہمایوں کی انتہا تک اور اکبر کی ابتدا میں بڑی بڑی جانفشانی خدمتیں کیں مگر جب بیرم خان کی اکبر سے بگڑی۔ تو اُس نے بیرم خان کا ساتھ دیا (آخر اُس کا بہنوئی تھا) اور بڑی گرم جوشی اور دلاوری سے کارنامے کئے۔ دشمنوں نے اکبر کے منقوش خاطر کر دیا کہ بیرم خان کو بھی فساد پر آمادہ کرتا ہے۔ جب قصبہ وکدار علاقہ جالندھر میدانِ جنگ ہوا تو چار دلاور میدان سے زخمی اٹھائے گئے۔ ایک اُن میں سے ولی بیگ تھا۔ اُس کی قسمت برگشتہ تھی۔ دشمن اپنے دربار میں چھپائے ہوئے تھے کہ پہلی چال قشاہوں پر کچھ خیال نہ کیا گیا۔ سر کاٹا گیا۔ اور امرائے مشرق کے پاس دوڑا دیا گیا کہ سب کو عبرت ہو۔ جب ہیموں سے مقابلہ ہوا تھا تو خان خانان کی فوج خان زماں کے آگے سینہ سپر تھی۔ اور نوجوان حسین قلی خاں نے بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں۔ عداوت کیا بُری بلا ہے! جب

بیرم خاں کی اکبر سے ناچاقی ہوئی۔ اور اہل فساد نے اکبر سے خان خانان کے نام فرمان لکھوایا تو اس میں اُس کی بے اعتدالیوں کی تفصیل لکھی کہ تم نے اپنے بہنوئی ولی بیگ کو درجۂ عالی پر پہنچایا۔ اور حسین قلی خان جس نے کبھی ایک مرغ کے پنجہ نہیں مارا اُسے اور اپنے تمام متوسّلوں کو عمدہ جاگیریں دیں۔

حسین قلی خاں وہی نوجوان ہے کہ جب بیرم خان نے بیوات سے طوغ و علم سامان امارت اکبر کے حسب الطلب بھیجا تھا۔ تو اُس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ کیونکہ وہ باوجود جوانی کے سلیم الطبع اور مزاج کا متحمل تھا۔ خان خانان سمجھا کہ شاید نیاز مندی اور ضعفِ حالی کے ذریعہ سے بگڑا ہوا کام بن جائے۔ یہاں دشمنوں نے اسے قید کروا دیا۔ مگر اکبر کے اوصاف کی کیا تعریف ہوسکے کہ جب پھر خان خانان کے لئے دلی سے پنجاب کو چلا تو (عبد المجید) آصف خان کو وہاں کا صوبہ دار کیا۔ اور جہاں اور ہدایتیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ اسے احتیاط سے رکھنا۔ کوئی صدمہ پہنچنے پائے۔ کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ خان خانان کے دشمنوں کا زور ہے۔ اور اُس کی اور اس کے متوسّلوں کی جان کے دشمن ہیں۔ جب بیرم خان کی خطا معاف ہوا تو سب کی معافی ہوئی۔ حسین قلی خان حضور میں حاضر رہتا تھا

پیدا نائی اور رسائی اس کی قابل تعریف ہے کہ سلطنت کے تختہ
رواں کا پایہ پکڑے چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ ماموں کے دشمنوں
سے اپنی حالت کو بچائے رکھتا تھا۔ اور جو خدمت اُسے ملتی تھی
اس طرح بجا لاتا تھا کہ حریفوں کو خبر نہ ہوتی تھی، اور نظر عنایت زیادہ
ہوتی جاتی تھی۔

سنہ ۹۷۰ھ میں مرزا شرف الدین حسین آگرہ سے باغی ہو کر بھاگے
اب حسین قلی خاں نے مزاج دانی اور خدمت گذاری کی سفارش سے
اتنا اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ بادشاہ نے اُسے خانی کا خطاب دیا
اُس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کو ساتھ کیا۔ اور سمجھا دیا کہ مرزا کو تسلی
و اطمینان دینا۔ نہ مانے تو استیصال کر دینا۔ امرائے متغیر کو فوجیں دیکر
کمک پر بھیجا۔ اور اجمیر و ناگور اس کی جاگیر کر دی۔ اُس نے مرزا
کو مارتے مارتے اجمیر سے ناگور اور وہاں سے میرٹھ پہنچایا۔ اور ریل
دھکیل کر ملک محروسہ کے باہر پھینک دیا۔ ملک کا عمدہ بندوبست
کیا۔ اور جودھپور پر فوج کشی کی۔ ذرا خدا کی شان دیکھنا ایک وہ
وقت تھا کہ مالدیو وہاں کے راجہ نے ہمایوں کو خود بلایا۔ اور عین مصیبت
اور تباہی کی حالت میں مروت کی آنکھوں میں خاک ڈالی تھی۔ اب
وہ مرگیا۔ اُس کا بیٹا چندرسین مسند نشین تھا۔ اب ملک مذکور

حسین قلی خان کی تلوار سے فتح ہو کر خاص جودھپور پر قبضہ ہوا۔ اور چند روز کے بعد سلطنت سے راج کا رشتہ ہو گیا۔

۹۷۴ھ میں اکبر نے رانا کی مہم پر بھیجا۔ وہ اودیپور تک مارتا چلا گیا۔ رانا بھاگ کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ بھاگا بھاگا پھرتا تھا جم کر نہ لڑتا تھا۔ لشکر بادشاہی سرگرداں ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے بلا لیا چتوڑ کے محاصرے میں پھر آ کر شامل ہوا۔ اور جان نثاری کے قدموں سے آگے آگے دوڑتا پھرا۔

۹۸۱ھ میں مرزا عزیز کوکہ کے خاندان سے پنجاب کا ملک لے کر تمام اتکہ خیل کو ملک پنجاب سے اور کمال گکھڑ کو اُس کے علاقہ سے بلا لیا اور ملک مذکور اُس کے اور اُس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کے نام کر دیا۔ مگر رنتھنبور کی مہم سامنے تھی۔ اس کا رکاب سے جدا کرنا مناسب نہ سمجھا جب قلعہ مذکور فتح ہوا تو بادشاہ آگرہ میں آئے۔ وہ اور اس کا بھائی لاہور میں آیا۔ اور بہت خوبی سے پنجاب کا انتظام کیا۔

۹۸۰ھ میں بادشاہ نے کسی بات پر خفا ہو کر راجہ جے چند والی نگر کوٹ (کانگڑہ) کو قید کیا۔ بدھے چند اس کا بیٹا سمجھا کہ باپ دربار میں مارا گیا۔ وہ کانگڑہ میں باغی ہو کر بیٹھا۔ بادشاہ کو غصہ آیا بھیش داس کو کبرائی سے راجہ بیربر بنا کر ملک مذکور اُن کی جاگیر کر

مصلحت اس میں یہ رکھی ہوگی کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ برہمن
کا نام درمیان رہے۔ حسین قلی خان کو حکم پہنچا کہ کانگڑے کو فتح کرکے
راجہ بیربر کو قبضہ دلوا دو۔ اس نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ اور لشکر
لے کر روانہ ہوا۔ جب دھمیڑی پر پہنچے تو جنبو وہاں کے حاکم نے
رستہ سے ہٹ کر وکیل بھیجے کہ میری راجہ سے قرابت ہے۔ حاضر
نہیں ہوسکتا۔ لیکن راہداری ذمہ میرا ہے۔ خان ملک گیر نے ماموں
کی تدبیروں کا دودھ پیا تھا۔ وکیلوں کو خلعت دیکر رخصت کیا
اور اپنا تھانہ بٹھا کر آگے بڑھا۔

کوٹلے کے حاکم نے مقابلہ کیا۔ یہ قلعہ حقیقت میں رام چند راجہ گلیر کا
تھا۔ رام چند کے دادا نے دبا لیا تھا۔ سپہ سالار نے جاکر اطراف
قلعہ پر نظر ڈالی۔ اور اِدھر اُدھر پہاڑیوں پر توپیں چڑھا دیں۔
دن بھر گولے مارے شام کو ڈیروں میں آیا۔ رات کو اہل قلعہ نکل کر
بھاگ گئے۔ صبح کو قلعہ قبضہ میں آگیا۔ اُسے راجہ گلیر کے حوالہ
کرکے آگے چڑھ گیا۔ جنگل کا یہ عالم ہے کہ درختوں کی کثرت
سے آسمان کے تاروں نے زمین کا منہ نہ دیکھا تھا۔ سپاہ اور
بھیر سب کو کلہاڑیاں دیدیں کہ کاٹو اور بڑھے چلو۔ کوٹ کانگڑہ
سامنے نظر آیا۔ باغ اور گھوڑوں کا میدان راجگان قدیم کے وقت

کا چلا آتا تھا۔ وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور قلعہ بھون کو گھیر لیا۔
یہاں مہا مائی کا مندر ہے۔ وہ پہلے ہی حملہ میں ہاتھ آ گیا۔ ہزاروں
برہمن پجاری اور راجپوت دھرم کا پُن سمجھ کر سینہ سپر ہوئے اور
سرخ رو دنیا سے گئے۔

(ملا صاحب فرماتے ہیں) خان جہاں آگے بڑھا۔ اور ایسے
رستوں سے کہ سانپ کا پیٹ اور چیونٹی کے پاؤں نہ ٹھیرتے تھے
ہزار نشیب و فراز لانگ پھلانگ کر گھوڑے ہاتھی۔ اونٹ۔ لاؤ
لشکر سمیت توپخانے اور قلعہ شکن توپیں پہنچا دیں۔ اور آبادیِ کوٹ
کانگڑہ کو قلعہ سمیت گھیر لیا۔ یہ متبرک و مقدس مقام بزرگان ہنود
کا ہے۔ یہاں لاک ہا لاک آدمی ہزاروں کوس دلایتہائے دور دست
سے تین موسم برس کر جمع ہوتے ہیں۔ اور ڈھیر کے ڈھیر سونا۔ اشرفیاں
کپڑے۔ شال دوشالے۔ جواہرات۔ انواع و اقسام کے نفائس۔ انبار
در انبار عجائب و غرائب چڑھاتے ہیں۔ غرض مقام مذکور کو پہلے
ہی دھاوے میں فتح کر لیا۔ پہاڑیوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ
کیا۔ مگر وہ پہاڑی گھاس کی طرح تلواروں سے کاٹے گئے۔ تماشا
یہ ہے کہ راجہ مندر میں خود موجود تھے۔ پھر بھی مندر کے گنبد پر جو سونے
کا چتر لگا تھا۔ تمام تیر دوز ہو گیا۔ اور مدتوں اسی طرح رہا۔

دو سو کے قریب کالی گائیں تھیں۔ ہندو ان کی بیحد تعظیم کیا کرتے تھے۔ اور پوجا کرتے تھے۔ اس وقت دار الامان سمجھ کر ان سب کو مندر کے اندر لے آئے تھے۔ اور کمانوں کے تیر بندوقوں کی گولیاں مینہ برسا رہے تھے تو بادشاہی لشکر کے سپاہی کیا ہندو کیا مسلمان ایسے جوش میں آئے کہ دین دھرم کا ہوش نہ رہا۔ گایوں کو کاٹ ڈالا ان کے خون موزوں میں بھرتے تھے۔ اور چاروں طرف مارتے تھے اے جہالت کے بہادرو! اگر جوش تھا تو حریفوں پر تھا۔ بے کس نے بس۔ بے زبان۔ تمہاری دودھ پلانے والیوں نے کیا لیا تھا جو یہ بیرحمی و بدسلوکی اُن کے ساتھ کی۔ مندر کے پجاری اتنے مارے گئے کہ شمار نہیں (ملا صاحب کہتے ہیں) ان باتوں سے کیا اپنے کیا بیگانے جنھیں یہ کہتا تھا کہ میں تمہارا گرو ہوں۔ وہی اُس پر ہزار ہزار لعنت اور ملامت کرتے تھے۔

حسین قلی خاں نے جب بھیم بل کی آبادی پر قبضہ کرلیا تو وہاں دمدمہ باندھا۔ اور ایک بڑی توپ چڑھا کر راجہ کے محلوں میں گولا مارا۔ راجہ اس وقت رسوئی جیم رہا تھا۔ مکان گرا اور اسّی آدمی دب کر ضائع ہوئے۔ راجہ کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ اور صلح کے دروازہ پہ آ کر کھڑا ہوا۔ قلعہ لیا ہی چاہتے تھے۔ جو خبر پہنچی

کہ ابراہیم حسین مرزا گجرات دکن سے شکست کھا کر لوٹتا مارتا آگرہ اور دلی ہوتا چلا آتا ہے اور لاہور کا ارادہ ہے۔ حسین قلی خان سُن کر متردد ہوا۔ جنگی نوجوان خوب جانتا تھا کہ سوا لیاقت اور جانفشانی کے دربار میں میرا کوئی نہیں (مرزا عبدالرحیم خان خانان ۶ ، برس کا لڑکا تھا) جو امرا ماتحت ہیں اُن میں کچھ تو ماموں کے ورنہ عداوت سے نفاق کے پتلے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر نہ دوست ہیں نہ دشمن مگر جو دوست ہیں وہ بھی کہنہ عمل سپاہی ہیں۔ یہ میرے ماتحت آجانا ایک زمانہ کا اتفاق سمجھتے ہیں۔ ان پہلوؤں کا لحاظ کرکے باوجود سپہ سالاری اور باختیاری کے آپ کچھ نہ کرتا تھا۔ جو کچھ کرتا تھا امرائے لشکر کے شمول اور اتفاق رائے سے کرتا تھا۔ چنانچہ سب کو جمع کرکے مصلحت کی صلاح ٹھیری کہ ادھر صلح کرکے پنجاب کی خبر لینی چاہیئے۔ وہ بدبخت ابھی نہ آنے پائے کہ ہم سامان درست کریں مگر خان جہاں اپنے رفقا سمیت کہتا تھا کہ یہاں کا نوالہ بھی ہونٹوں تک آگیا ہے۔ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن امرا نے زیادہ زور دیا تو بہت سی گفتگو کے بعد اُس نے کہا۔ کہ اچھا سب امرائے لشکر ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی اپنی مہریں کردیں۔ بادشاہ اس صلح سے خوش نہ ہوئے۔ تو تمہیں صاحبوں کو جواب دینا ہوگا۔ سب نے کاغذ مرتب کرکے دیا۔ ادھر راجہ نگرکوٹ نے بھی غنیمت

سمجھا اور جو جو شرطیں کہیں سب منظور کرکے لکھ دیں۔ چوتھی شرط پر گفتگو ہوئی
کہ یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُن کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہئے
یہ بھی منظور ہوا۔ اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا کہ اس میں ترازو کے تول فقط ۵ من
سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اسی دوڑ دوڑی میں قلعہ کے سامنے ایک نمودار
مقام پر پیش طاق عالی شان تعمیر کروایا۔ اُس کے ممبر پر ملا محمد باقر نے کھڑے
ہوکر اکبری خطبہ پڑھا۔ جب بادشاہ کا نام آیا اس پر اشرفیاں برسائیں
اور مبارکبادیں کہہ سُن کر ملک میدان کو روانہ ہوئے۔

حسین قلی خان سیل کی طرح پہاڑ سے اُترا۔ معلوم ہوا کہ گگا دن
گاؤں میں ہل چل پڑ رہی ہے۔ لاہور والوں نے دروازے بند
کر رکھے ہیں۔ اور مرزا ملتان کی طرف چلا جاتا ہے۔ خان جہاں نے اس کے
پیچھے گھوڑے ڈالے اور مارامار اپنے شکار کو جا لیا۔ وہ مرزا سے چھری کٹار
ہوا چاہتا تھا۔ کہ حسین قلی خان بھی پیچھے پیچھے آن پہنچے اور اس وقت
وہ خان جہاں سے ایک پڑاؤ پیچھے تھے۔ خان جہاں کو تلنبہ کئی کوس
آگے نظر آتا تھا۔ جہاں مرزا لشکر ڈالے پڑا تھا۔ حسین خان نے
انہیں خط لکھا۔ کہ چار سو کوس سے یلغار مار کر یہاں تک آیا ہوں۔
اگر اس فتح میں مجھکو بھی شریک کرو۔ اور ایک دن لڑائی میں دیر کرو
تو تمام تار محبت سے دور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر ترک بچہ تھا۔ ولی بیگ

ذوالقدر کا بیٹا اور بیرم خان کا بھانجا۔ خط سُن کر زبان سے کہا۔ خوش باشد
اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک پہنچی اور کر گیا۔ اسی دن مارا مار تلنبہ کے میدان
میں (جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے) تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اُس کے
آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں
تھی۔ بعضے بے سامان پریشان تھے۔ جنگِ میدان کی لڑائی کا بھی انتظام
نہ ہو سکا۔ مرزا کا چھوٹا بھائی پیش دستی کر کے حسین قلی خان کی
فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا۔ وہ نوجوان
لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا شکار سے پھرے۔ اتنے میں کام ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہر چند
سپاہیانہ کوششیں کیں اور مردانہ حملے کیے۔ کچھ نہ ہو سکا آخر بھاگ نکلا۔
فتح کے دوسرے دن حسین خان پہنچے۔ حسین قلی خان نے میدان
جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خان نے
کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے۔ تمہیں تعاقب کرنا چاہیے تھا کہ جیتا
پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ اُس نے کہا کہ تکر کوٹ ابھی یلغار کر کے آیا
ہوں۔ لشکر نے وہاں بڑی محنتیں اُٹھائیں۔ اب اُن میں طاقت نہیں
رہی۔ یہی بڑی فتح تھی۔ اب اور دوستوں کی باری ہے۔ (یعنی تمہاری) فخ
۹۸۱ھ میں اکبر گجرات کی مہم فتح کر کے آئے تھے۔ اور امراء بھی اطراف
و جوانب سے ادائے تہنیت کے لیے حاضر ہوئے تھے کہ ادھر سے حسین قلی خان

دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے باغیوں میں سے ہر ایک کے رتبہ کے بموجب کسی کے منہ پر گدھے کی۔ کسی پر سور کی کسی پر کتے کی۔ کسی پر بیل کی کھال۔ کانوں اور سینگوں سمیت چڑھا ئیں۔ اور عجیب سوانگ بنا کر دربار میں حاضر کیا۔ کل ۳ سو آدمی کے قریب تھے مرزا کے ساتھیوں میں سے تقریباً سو آدمی تھے کہ دعوی کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے۔ حسین خاں سب کو پناہ دے کر اپنی جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی کہ حضور میں اُن کی خبر پہنچ گئی۔ اس لئے سب کو رخصت کر دیا تھا۔ حسین قلی خاں کی ہمت و حوصلہ کو آفریں ہے۔ جب مفصّل حال لڑائی کا بیان کیا۔ تو اُن لوگوں کے نام بھی لئے۔ مگر یہ کہہ دیا کہ قیدیوں کے باب میں حضور سے قتل کا حکم نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دیئے اکبر نے کچھ نہ کہا اور جو خبر پہنچی تھی وہ بھی زبان پر نہ لائے۔ حسین قلی خاں کو نیک نیتی کا پھل ملا کہ خان جہاں کا خطاب پایا۔

جب مرزا سلیمان بدخشاں سے تباہ ہو کر آیا۔ تو اکبر کو بڑا خیال ہوا۔ کچھ تو اس جہت سے کہ بدخشاں سرحد کی مضبوط دیوار ہے۔ دوسرے ملک موروثی کا رشتہ ہے۔ تیسرے خود نامور کوہستان ہے اور اُزبک کے قبضہ میں آگیا ہے۔ خان جہاں کو حکم ہوا کہ پانچ ہزار سوار جرار لے کر

جاؤ اور مرزا کو اُن کے گھر میں بٹھا کر لاہور میں چلے آؤ۔ مگر ساتھ ہی
خبر آئی کہ منعم خاں کے مرنے سے بنگالہ میں پھر فساد ہوا۔ اور داؤد نے
عہدنامہ توڑ ڈالا۔ امرائے شاہی پہلے سے بھی گھبرا رہے تھے اور
خرابی ہوا سے تنگ تھے۔ اِس نازک موقع پہ سب نے بنے بنائے
گھر چھوڑ دیئے ملک مذکور سے نکل آئے۔ اکبر کو یہ بھی خیال تھا۔ کہ
مرزا سلیمان بدنیت اور لالچی آدمی ہے۔ بہتر ہے کہ بدخشاں کا کچھ اور
بندوبست ہو جائے۔ مرزا سے کہا کہ تم فوج لے کر جاؤ۔ اور بنگالہ کو
اپنا بدخشاں سمجھو۔ اُس نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ ۹۸۳ھ میں خان
جہاں کو بلا کر خان خاناں کا قائم مقام کرکے قبائے زردوزی۔ چار
قب طلا۔ کمر شمشیر مرصع۔ اسپ بازین طلائی دے کر روانہ کیا۔ اور
ٹوڈرمل کی رفاقت سے اس کا بازو قوی کیا

جب وہ بھاگل پور علاقہ بہار میں پہنچا۔ تو امرائے بخارہی و
ماوراء النہری دونوں سے غور جین بھرے گھروں کو پھرنے کو تیار تھے۔
اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ زبردست اور کاردان افسر کے نیچے
کام دینا کچھ آسان کام نہیں۔ بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔
بعضوں نے کہا یہ قزلباش ہے۔ اس کے ماتحت ہم نہیں رہ سکتے۔
بالیاقت دوستو! پہلے کہہ چکا ہوں۔ اور پھر کہتا ہوں کہ جب کم لیاقت

دعوے دار اپنے حریف کو لیاقت سے نہیں دبا سکتا تو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتا ہے اور اکثر فتحیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس حکمت عملی سے احمقوں کی بہت سی فوج اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے ؛

خاندانی تجربہ کار نے خاموشی اختیار کی۔ اور علوئے حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھائی۔ اسمٰعیل قلی خان اس کا بھائی پشت دستی کی تلوار ہاتھ میں اور پشتینی قدیمی کی فوج رکاب میں لے کر چاروں طرف ترکتاز کرنے لگا۔ ٹوڈرمل ہندو کی نمک نیتی کو ہزار آفرین ہے۔ کہیں دوستانہ فہمائش کی۔ کہیں ڈراوے۔ کہیں لالچ سے سب کو پرچا لیا۔ کہ لشکر بنے کا بنا رہا اور کام جاری ہو گیا۔ وہ دونوں باوقار مل کر بڑے حوصلے اور کھلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔ پھر کوئی بیہودہ گو کیا خیال کر سکتا تھا۔ جا بجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اور کامیابی پر ختم ہوتی تھیں۔ چنانچہ گڑھی کو کہ بنگالہ کا دروازہ ہے جاتے ہی کھول لیا۔ اور ٹانڈہ تک کا ملک پھر صاف کر لیا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہوا کام پھر بنا لیا۔

مشرقی مہم کا خاتمہ اخیر حملہ داؤد کا تھا۔ کہ قدیمی سرداروں کو لے کر سرک محل پر عین موسم برسات میں لڑائی کو تیار ہوا۔ خان جہاں کے لشکر میں غنیم کے ہجوم کی ایسی دھوم مچی۔ کہ سب کے جی چھوٹ گئے

مگر خان جہاں اور راجہ نے سب کو تسلی دے کر دل بڑھائے۔ اور فوجیں لے کر فوراً ٹانڈہ پر پہنچے داؤد وہاں سے ہٹ گیا اور آگ محل پر مقام کر کے قلعہ بنایا۔ خان جہاں بھی ساتھ ہی پہنچے۔ اور سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ ساتھ ہی بادشاہ کو عرضیاں لکھیں۔ اور امرائے اطراف کے پاس خط دوڑائے۔ مظفر خاں بہار میں چھاؤنی ڈالے ملک کا انتظام کر رہا تھا۔ اسے بھی مدد کو بلایا۔ مظفر خاں اصل میں بیرم خانی امنت تھے لیکن ایک تو اہل قلم اہلکار۔ دوسرے پرانے پاپی اور کہنہ عمل سپاہی۔ انھوں نے ٹالا۔ اور ادھر سے بادشاہ نے یساول دوڑائے۔ کہ تمام امرائے اطراف کو واجب ہے کہ دل و جان سے حاضر ہو کر خان جہاں کے ساتھ شامل ہوں۔ مظفر خاں کے ساتھ بھی بڑے بڑے دلاور۔ صاحب فوج امیر تھے۔ اس نے ان سے مشورت کی۔ ارباب جلسہ نے کہا کہ برسات کا موسم۔ ملک کا یہ حال۔ سپاہی بے سامان۔ اس حال میں سپاہ کو لیجا کر ویران کرنا خودکشی میں داخل ہے۔ چند روز صبر کریں۔ شروع زمستان طلوع سہیل پر تازہ زور لشکروں کے ساتھ چڑھائی کریں کہ دشمن کو فنا کر دیں۔ اتنے میں محب علی خاں بگڑ کر بولا کہ حضور کا فرمان اس تاکید کے ساتھ پہنچا ہے۔ خان جہاں نے بلایا ہے۔ آراستہ فوج پاس ہے۔ جب یہاں تک آن پہنچے ہیں تو

پھر انکا مردانگی سے بعید ہے اور وفا و اخلاص بھی نہیں اجازت دیتی۔ مناسب یہی ہے کہ سب یک دل و یک رائے ہوکر دشمن پر حملہ کریں البتہ خان جہاں سے یہ فیصلہ کرنا چاہئے۔ اگر ہمارے آتے ہی لڑائی شروع کردو تو ہمیں بلاؤ۔ اور ہمارے آنے پر بھی لشکر بادشاہی کا انتظار رکھو۔ تو ہم اپنے لشکر کو اس برسات میں کیوں برباد کریں۔ خان جہاں نے دو امیروں کو بھیجا۔ پیمان کے پیامبر ہوئے۔ اور عہد کے ناموں سے یہ اقرار مضبوط ہوئے۔ سب تقریریں طے ہوکر دونوں لشکر شامل ہوئے جب مظفر خاں وغیرہ قریب پہنچے تو خان جہاں دور تک خود استقبال کو آیا۔ اپنے ہی ڈیروں میں لے گیا۔ دھوم دھام سے ضیافتیں ہوئیں۔ اور صلاح مشورے ہوکر جھٹ پٹ اٹک محل کے سامنے میدان جنگ قائم کردیا۔

دونوں سپہ سالار فوجیں لے کر میدان میں آئے۔ فوجوں نے قلعہ باندھے۔ اور لڑائی شروع ہوئی۔ مگر جب حملے ہونے لگے تو سب بند و بست ٹوٹ گئے۔ جو فوج مقابل کی فوج سے ٹکر کھاتی تھی۔ بجلی کی طرح چکر مارتی نظر آتی تھی۔ دن آخر ہوگیا۔ خان جہاں حیران کھڑا تھا۔ کہ لڑائی ترازو ہے دیکھئے پلہ کدھر جھکتا ہے۔ دفعتاً کالا پہاڑ غنیم کے سپہ سالار کے تیر لگا۔ اور وہ بھی ایک ہی تیر سے ناکام

بھاگا۔ اس کے بھاگتے ہی سارے پٹھان بھاگے۔ کیچڑ پانی کے سبب سے زمین کا پتا نہ تھا۔ بادشاہی فوج وہیں تھمی رہی۔ شام قریب تھی۔ غنیم نے بھی پیچھے ہٹ کر لشکر ڈال دیا۔ اکبری اقبال کی طلسم کاری دیکھو کہ رات کو بادشاہی توپ خانے سے دشمن کی طرف توپیں مار رہے تھے۔ جُنید افغان اپنے پلنگ پر پڑا سوتا تھا۔ ایک گولہ ایسا جا کر لگا۔ کہ ران شیشے کی طرح چور چور ہو گئی۔ وہ پیرانہ پٹھان داؤد کا عموزاد بھائی اور افغانوں کا رکن خاندان تھا۔ پٹھانوں کی تلوار کہلاتا تھا۔ اس میدان میں فوج کا بایاں بازو تھا۔ اور لڑائی کے ہتھکنڈے خوب جانتا تھا۔ اس کے مرنے سے سارے افغان چپ رہ گئے۔

اِدھر اکبر کو امرا کی عرضیاں برابر پہنچ رہی تھیں کہ خانہ زادے بیڈھب کیچڑ میں پھنسے ہیں۔ جب تک حضور اقبال کے گھوڑے پر نہ سوار ہونگے منزل مراد کا رستہ بند ہے۔ برسات گندہ بہار موسم ہندوستان کا ہے۔ اس ملک بنگالہ کے امرا کا ہی کرتے ہیں۔ اِدھر تو یہ حال تھا، اُدھر اِدھر مان سنگھ کوہستان اودے پور میں رانا سے رن جھوجھ رہے تھے اکبر کی چشم انتظار ایک اُدھر تھی۔ ایک اِدھر کہ سید عبداللہ خان رہ مان سنگھ کے لشکر سے ڈاک میں فتح کی خوشخبری لے کر آئے۔ اکبر بہت خوش ہوا اور انھی کو سر سواری بنگالہ روانہ کیا۔ خلعت

کے وقت یہ بھی کہا کہ اُمرا کے نام فرمان تاکید اہتمام میں تحریر کرتا اور کہنا کہ ہم آپ یلغار کرکے آتے ہیں۔ پانچ لاکھ روپیہ کا خزانہ بھی سید کے ساتھ دوڑایا کہ خان جہاں کے خرچ کا ہاتھ کشادہ ہو اور بہت سی کشتیاں رسد غلّہ کی آگرہ چھُٹیں۔ رخصت کے وقت یہ بھی کہا کہ سید! چنانچہ این مژدہ می بری۔ انداں جا ہم بشارت فتح می آری۔

پیچھے بنگالہ سے ایسی پریشان خبریں آنی شروع ہوئیں کہ سپاہی طبع بادشاہ نے تکلیف سفر اور خرابی موسم کی کچھ پروا نہ کی۔ آپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لشکر کو خشکی کے رستہ روانہ کیا۔ اور تجویز کی کہ آپ آبی گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا کی طرح پانی پر جائیے۔

اب اُدھر کی سنو کہ دونوں لشکر نواح کہل گاؤں میں آمنے سامنے تھے۔ سید عبداللہ بھی پہنچ کر انتظام میں شامل ہوئے۔ رات کو جنید کا کام تمام ہوا۔ دوسرے دن خان جہاں نے حملہ کر دیا۔ اور کیچڑ پانی کو روندتے سوندتے جس طرح ہوا جا ہی پڑے۔ افغان بھی دل شکستہ تھے۔ جانوں سے ہاتھ دھوکر اڑے۔ اُس وقت اُمرائے بادشاہی نے یہی مناسب دیکھا کہ دستبرد کرکے ہٹیں۔ اتنے میں پیچھے سے مدد پہنچی۔ پھر بھی لڑتے تھے اور ہٹتے آتے تھے۔ اقبال اکبری کی کارسازی دیکھو کہ افغانوں کے سردار خان جہاں نے پھر زخم کھایا اور مرکر گرا۔ اُس وقت غنیم بے ہتھیار

ہوئے اور سب بھاگ نکلے۔ لشکر پادشاہی نے بڑے زور شور سے تعاقب کیا۔ ہزاروں کو مارا۔ سیکڑوں کو باندھا۔ ترک چاروں طرف مارتے پھرتے تھے۔ داؤد شاہ بیچارے کا گھوڑا ایک چہلے میں پھنس گیا اور گرفتار ہوا۔ ہمایوں کے بھائی بھی عجیب کیتہ در ردجیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ ہندال کے ہمدموں میں خواجہ ابراہیم ایک شخص تھا۔ اس کا بیٹا طالب یارشش اب اکبری نمک خواروں میں تھا۔ لیکن جو شور انگیز نمک باپ نے کھایا تھا۔ اس کے فساد کو اکبری نمک ہرگز اعتدال پر نہ لاسکا۔ طالب کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ داؤد یہی ہے۔ پہنچا اور رفاقت کرنے لگا کہ نکل جائے۔ مراد سیستانی اور حسین بیگ کو خبر ہوگئی۔ وہ باز کی طرح پہنچے اور شکار کو پکڑ لیا باندھ کر لے آئے۔ سپہ سالار ابھی میدان جنگ میں کھڑا تھا۔ دلاور اپنے اپنے کارنامے سنا رہے تھے۔ داؤد سامنے حاضر کیا گیا۔ ایک حسین صاحب جمال اور دیدار دجوان تھا۔ اس وقت خاموش کھڑا تھا۔ گرچہرہ شگفتہ تھا اور کسی طرح کا اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ بہت پیاسا تھا، اس نے پانی مانگا۔ لشکر کے لوگ دکھ بھرتے پھرتے تھک گئے تھے۔ ایک کم ظرف دل جلے نے جوتی میں پانی بھر کر سامنے کیا۔ داؤد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دریا دل خان جہاں نے اپنی صراحی اور تھالی کٹورا منگاکر پانی دیا۔ اور پوچھا کہ عہد نامے کے بعد بے وفائی

کرتی ۔ یہ کیا رسم اور کیا آئین ہے؟ اس نے بڑے استقلال سے کہا کہ عہد منعم خاں کے ساتھ تھا۔ اب آزاد۔ تھوڑی دیر آرام لو تمھارے ساتھ الگ عہد و پیمان ہوگا۔ خان جہاں کا ارادہ ہرگز نہ تھا کہ اسے قتل کرے۔ امرا نے کہا کہ اسے زندہ رکھنے میں فساد کا احتمال ہے۔ ناچار قتل کا حکم دیا۔ جلاد نے دو ہاتھ مارے۔ تلوار کارگر نہ ہوئی۔ آخر لٹا کر ذبح کیا۔ کاٹ کر صاف کیا۔ بھس بھرا۔ اور عطریات مل کر حضور میں بھیج دیا۔ دھڑ ٹانڈہ کو روانہ کیا۔ کہ اس کا دار الخلافہ تھا۔ بادشاہ فتحپور سے سوار ہوئے تھے۔ پہلی ہی منزل تھی۔ پانچ کوس پر ڈیرے پڑے تھے کہ سید عبداللہ خاں اپنی روانگی کے گیارھویں دن آن پہنچے۔ اور داؤد کا سر جلو خانہ اقبال پر لاکر ڈال دیا۔ لشکر بادشاہی میں عجب خوشی کا غلغلہ اٹھا۔ اکبر نے سجدہ شکر ادا کیا اور فتحپور چلے گئے۔

سید میرک ایک مرد بزرگ علم جفر میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ کئی دن پہلے بادشاہ نے ان سے سوال کیا تھا۔ جو حکم انھوں نے لگایا تھا، ٹھیک وہی ہوا۔

خان جہاں نے راجہ کو رخصت کیا۔ آپ ست گام نواح ہگلی کی طرف لشکر لے کر گیا کہ داؤد کا اصلی مقام وہی ہے۔ افغانوں نے جا بجا شکستیں کھائیں۔ اور اکثر حاضر خدمت ہوگئے۔ جمشید اس کا

خانخیل بڑے زور شور سے اڑا مگر بڑی ہی شکست کھائی۔ داؤد کی ماں بھی سب خاندان کو لے کر اس کے دربار میں آئی۔ اس سے تمام مفسدوں کی ہمت ٹوٹ گئی ۔

کوچ بہار کا راجہ مال گوسائیں بھی رجوع ہوا۔ اس کے تحائف مع چون ۵۴ ہاتھیوں کے دربار میں بھیجے۔ پہاڑی سے ملک میں بھی پٹھانوں کی بہت سی کھرچن باقی تھی ۔ جیسے خان وغیرہ یہاں کے ملک میں ہمیشہ فساد کی آگ سلگاتے رہتے تھے۔ اُن پر لشکر بھیجا۔ وہ بھاگ گئے ۔ جو باقی رہے اُنھوں نے اطاعت اختیار کی۔ اور بنگالہ بہار وغیرہ تمام ملک کہ فساد خانہ پٹھانوں کا تھا۔ (امرائے دربار اسے بلغاک خانہ فساد کہا کرتے تھے) فتنہ سے پاک ہوگیا۔ اور فارغ ہوکر صحت پور میں آئے کہ آپ ٹانڈہ کے پاس آباد کیا تھا۔ خیال تھا کہ یہاں آرام سے بیٹھینگے صحت پر الٹا اثر پڑا۔ چند روز کے بعد بیمار ہوگئے۔ مرض نے چھ ہفتہ طول کھینچا۔ بیدوں کا علاج ہوتا تھا۔ صاحب ماثر الامرا کہتے ہیں کہ آنھوں نے بے سمجھے علاج کیا۔ بھلا قضا کا علاج کس کے پاس ہے ؟ آخر انیسویں شوال ۹۸۳ھ کو دنیا سے انتقال کیا۔ بادشاہ کو رنج ہوا۔ بہت افسوس کیا۔ مغفرت کے لئے دعا کی اور اسمعیل قلی خاں کو بڑی تسلی و تشفی کے ساتھ

فرمان لکھا۔ دو بیٹے رہے۔ رضا قلی خاں کہ ۳۵۰ کا منصب دار تھا سنہ ۱۰۴۷ھ
میں پانصدی منصب ۳ سو سپاہی کا عہدہ دار ہوا (۲) رحیم قلی کہ ۲۵۰
کا منصب دار تھا۔

تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے تعمیل احکام اور
ادائے خدمت کے سوا کسی بات کا شوق نہ تھا۔ نہ آپ قدم بڑھا کر
رکھتا تھا نہ کسی کے بڑھے ہوئے قدم کو ہٹاتا تھا۔ ہمت کے ذوق شوق
اور جانفشانی کے جوش و خروش سب خدمت بادشاہی میں نکال دیتا
تھا۔ وہ سلامت روی کے گوشہ میں بیٹھا ہی کرتا تھا۔ اسی واسطے امرا
کی کسی سے مخالفت بھی نہیں ہوئی۔ اُس نے فتوحات سلطنت کے
سوا کوئی اور امیر نہ یادگار بھی نہیں چھوڑی۔ البتہ ہمت کی بیرم خاں
اپنے ماموں کی ہڈیاں اس کے مرنے کے ۱۸ برس بعد مشہد مقدس
بھجوا دیں۔

تمام شد

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپا۔